

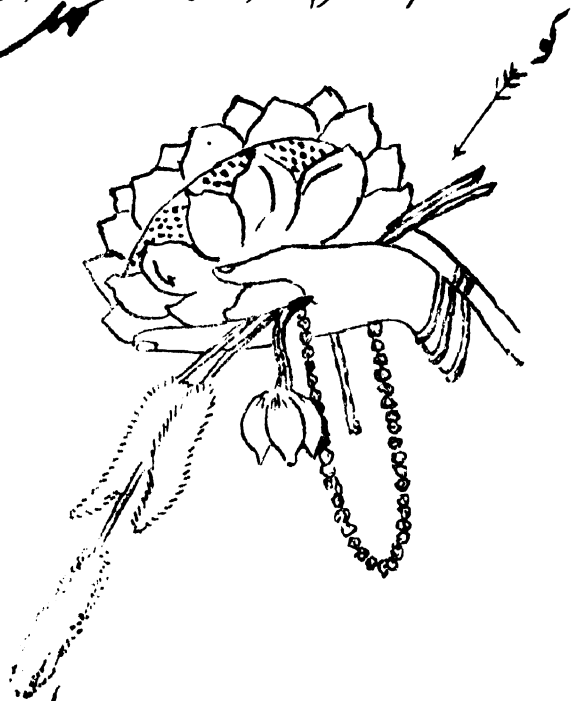
UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222283

UNIVERSAL
LIBRARY

TIGHT BINDING BOOK

اُلفت و عقیدت کی بنا پر رفیقِ محترم شہری بیتِ امراتسری



شانتی نرائن شاد

امرت سر
 بر مالی شاد ۹۳ء

فہرست

۹	شعلہ الفت	۱
۲۱	شعلہ آتش	۲
۳۵	شعلہ کدورت	۳
۴۳	شعلہ نفس	۴
۵۷	شعلہ انتقام	۵
۷۳	شعلہ غم	۶
۹۷	شعلہ چراغ	۷
۱۰۷	شعلہ اجل	۸
۱۲۵	شعلہ رخ	۹
۱۳۹	شعلہ یاس	۱۰
۱۶۱	شعلہ تبسم	۱۱
۱۷۳	شعلہ نور	۱۲
۱۹۷	شعلہ دل	۱۳
۲۱۵	شعلہ الم بہت آچھا آسان ہے	۱۴
۲۳۷	شعلہ آب	۱۵

Checked 1939.

دیباچہ

دور حاضر کے ہندوستانی ادیبوں میں شری ٹیگور کا زہر سب سے اونچا ہے۔

ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم کے شعرا نے آپ کے آگے تسلیم خم کیا ہے۔ آپکی تصانیف کی عظیم
نیل کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہے لیکن افسوس کہ جہاں دوسرے زمانہ ان

آپکی ادبی خدمات سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ وہاں اردو دان اصحاب اس بے بہرہ ہیں۔ اس
برداشت کی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے آپکی چند شہرہ آفاق تصانیف کو مندرجہ ذیل ناموں

سے اردو جاہر پہنایا جیون پر بھات، طوفان، ترکش، دنیا ایک کہانی ہے، ٹیگور کے افسانے
علاوہ انیس گویا اور بغاوت زیر طبع ہیں۔ امید کامل ہے شاعر اعظم ٹیگور کے دیگر شاہکار بھی

جلد از جلد آپ کے دست مبارک تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گا۔

چند سال پہلے میں نے ڈاکٹر ٹیگور کی کہانیوں کا ایک مجموعہ پڑھا تھا۔ ہر کہانی میں ایک

تھا۔ سوز تھا۔ سبق تھا۔ میں نے ان میں سے چند کہانیاں منتخب کیں۔ اور اس چناؤ میں

بات کا غافل خیال رکھا گیا۔ کہ ہر کہانی سے کچھ سبق حاصل ہو سکے۔ اس کے بعد کتاب

کا نام تجویز کرنے میں کافی چھان بین کرنی پڑی۔ نتیجہ کے طور پر سرد شعلے پیش خدمت
 ہیں جو ایشیا کے اس عظیم ترین شاعر کے خاص افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قدرتی مناظر کی
 دل فریبی اور دلکشی، فراق اور طوفان، انجیز کالی راتیں، حسن اور عشق، محبت کے کرشمے، بے
 دفاعی اور جفاکاری، سوسائٹی کے ظلم، بابو سیال، ستم بے داد، غم دیاس، فریب فطرت
 جلع دیوں کی آہ یہ سب کچھ آپ کو ان افسانوں میں دیکھنے پر ملے گا۔ ہر افسانہ اور اس کا ہر
 ایک لفظ اپنے اندر خاص کشش لئے ہوئے ہے۔ دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ آپ پر ایک
 خاص قسم کی محویت طاری ہو جائے گی جس کا اثر آپ کے دل کی گہرائیوں میں مدت
 تک بنا رہے گا۔ ہندوستان کو فخر ہے کہ اس نے دنیا کو ایک درخشندہ ستارہ عطا کیا ہے۔
 جس کی تہلی سے آج ادنیٰ دنیا کے زمین و آسمان روشن ہیں۔ مصنف نے لفظ لفظ میں
 ایک سوز بھر دیا ہے ایک آگ ہے۔ اٹھتا ہوا شعلہ ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا میں اپنا فرض ادا لین تصور کرتا ہوں کہ حضرت یگور کے بلند ترین
 پاکیزہ خیالات کی صحیح ترجمانی کر سکتا ناچیز کی قابلیت سے دور ہے۔ اسی وجہ سے ترجمہ میں
 دقت پیش آئی ہے مگر باوجود ہر بات کے میں نے مصنف کے خیالات کو مکمل طور پر ظاہر کرنے کی
 کوشش کی ہے میں کہاں تک کامیاب ہوا یہ ناظرین خود ہی اندازہ لگائیں گے۔ اس میں جو کچھ
 اچھایاں اور قابلِ داد باتیں ہیں، ان سب کا سہرا قابلِ مصنف کے سر ہے اور اس میں جو نقائص
 ہیں۔ ان کی تمام ترمیم داری کے لئے مترجم شرمندہ احساس ہے۔

”رحمت پر ان کی میرے گناہوں کو ناز ہے“

(شاد کجاسی)

سرد شعلے

بلبل نے آہ کھینچی ہے کس سوزِ دل کے ساتھ
اک آگ سی لگی ہوئی صحنِ چمن میں ہے

نیگور

تمام حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

شعلهٔ اُفت

افسانه نمبر ۱۰

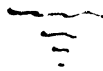
اُس کے دربار میں

اے میری زندگی کے مالک! کیا ہر روز میں تیرے مقابل کھڑا
رہ سکوں گا؟۔۔۔ بھروسہ کے مالک! کیا میں ہاتھ جوڑ کر تیرے سامنے
کھڑا رہوں؟

کیا تیرے وسیع آسمان کے نیچے۔ غیر آباد تنہائی و سکون میں
نرم دل سے میں تیرے سامنے کھڑا رہوں؟

کیا تیرے مَصروف عالم میں جہاں چاہ کی کوشش اور ہنگامہ بپا ہے۔
ووڑ دھوپ میں لگے ہوئے انسانوں کے درمیان تیرے سامنے
کھڑا رہ سکوں گا؟

اے شاہوں کے شاہ! جب اس دُنیا میں میرا کام ختم ہو جائیگا
تو کیا میں تنہائی اور خاموشی سے تیرے سامنے کھڑا رہ سکوں گا؟



مشعلُ الفت

میری پروس ایک بیوہ ہے — بیوہ۔ وہ بیوہ جس نے
 دُنیا کا کچھ بھی نہ دیکھا ہو۔ اس کے والدین نے بچپن میں ہی اس کی
 شادی کر دی۔ یہی اُس کا گناہِ عظیم تھا۔۔ وہ اُس ایک کلی کی طرح تھی۔
 جو بغیر کھلے ہی شاخ سے الگ کر دی گئی ہو! بھول تو کچھ دن بہا رہا غمِ نشانِ دلدار
 میں دل ہی دل میں اس کی پرستش کرتا ہوں۔ اس کے متعلق جو
 خیالات میرے دل میں ہیں۔ اُسے سوائے ”پرستش“ کے پاک لفظ کے
 اور کسی ایسے لفظ سے لکھنا نہیں چاہتا۔
 میرے اس راز کے متعلق میرے دوست کشور بھی کچھ نہ جانتے تھے۔

اس لئے اس طرح جو میں نے اس معاملہ کو اپنے دل کی گہرائی میں چھپائے رکھا۔ اس کا مجھے ایک قسم کا غرور سا تھا!

لیکن دل کی حالت اس دریا کی طرح ہے۔ جو اپنے منبع میں رُکنا نہیں چاہتا۔ اور کسی طرح بہہ ہی نکلتا ہے۔ اور اگر کبھی تعیل خواہش میں ناکام رہتا ہے۔ تو وہاں مثل سیلاب تڑپتا ہوا۔ ایک میٹھا درد پیدا کر دیتا ہے۔

تمام بالابا توں کو سوچتے ہوئے۔ خیال پیدا ہوا کہ اپنے ولی خیالات کو عملی طور پر شعروں کی شکل میں تبدیل کر دوں۔ لیکن۔ واہ قہمت۔ کیا کہوں۔ بے بس ہوں۔ ”ظالم قلم اس بہاؤ کی طرف چلنے کو رضامند نہیں۔ شائد وہ یہ راستہ مشکل اور خوفناک سمجھتا ہے۔

اُسی دوران میں ایک حیران کن اور پُر اسرار بات ہوئی۔ میرے دوست کشور نے آندھی کی روانی اور زلزلہ کی تیزی سے شعر کہنا شروع کر دیے۔ اس سے پیشتر وہ کبھی بھی شعر و شاعری کی طرف راغب نہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی اس کا رجوع کبھی اس طرف ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کہ نہ اُسے شعر کہنے کا ڈھنگ اور نہ نظم لکھنے کا سلیقہ۔ پھر بھی اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ شاعری۔ بوڑھا پے میں بنی ہی ہوئی۔ عورت کی طرح اس کے سر پر سوار ہو گئی۔ آخر وہ شعروں کی درستی پر میری مدد کے لئے میرے

بھی ہو کیا؟

ایک شاعر کی طرح — ”میرا دماغ کسی کے تصور میں نہ معلوم کہاں سے کہاں چکر لگا رہا تھا“ سچائی ہی ایشور ہے۔ تصور ہی زندگی ہے۔ سچی کہانی۔ خیالات کی لہروں کو ایک پتھر کی طرح دبا رکھتی ہے لیکن خیالات اس کا راستہ کھول دیتے ہیں۔

کشور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ مجھے بھی تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ درست ہے۔ پھر چند لمحہ خاموش رہ کر بولا۔ ”درست۔ بالکل درست!“ میں یہ پیشتر ہی تسلیم کر چکا ہوں۔ کہ میری محبت میں کچھ شبہ سا تھا۔ اسی لئے تو میں اب تک اپنی طرف سے کچھ نہ لکھ سکا تھا۔ لیکن جب کشور کو پس پردہ بٹھالیا۔ تب میری قلم نے بھی اپنا منہ کھول دیا۔ میں کشور کی آڑے کر لکھنے لگا۔ میری نظمیں عموماً عشق کی گہرائیوں سے بھری ہوتیں۔ ان میں میرا دلی راز پنہاں ہوتا۔ مایوسی ہوتی۔ اور ان سب کے علاوہ میری نابینا الفت کا راز ہوتا۔

کشور نے ایک دن کہا۔ ”یہ تمہاری نظمیں ہیں۔ انہیں میں تمہارے ہی نام سے شائع کراؤں گا!“

”خوب! لکھی ہوئی تو تمہاری ہیں۔ میں نے تو تصوف ڈاؤن بدل کیا ہے۔ ان پر تمہارا ہی مکمل حق ہے“

آہستہ آہستہ کشور کو بھی اس کا یقین ہو گیا !

میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ جس طرح ایک نجومی ستاروں کا ذکر کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ میں بھی اُسی اپنے ہمسایہ گھر کی رنگ دار کھڑکیوں کو دیکھتا ہوں۔ اور کبھی کبھی تو سچا رسی کی پرستش سے دیوی کے نیاز بھی حاصل ہو ہی جاتے ہیں۔ اُس بد نصیب کے چہرہ سے یاس و غم کے آثار ہویدا تھے۔ آنکھوں سے حیا ٹپکتی تھی۔ اُس کے دیکھنے سے میرے دل کا کچھ بوجھ ہلکا سا ہو جاتا تھا۔

اُس دن مارچ مہینہ کے تیسرے پر۔ آسمان پر بادل گھنے چھا رہے تھے۔ آندھی آنے کو تھی۔ کبھی کبھی بجلی بھی چمک اُٹھتی تھی۔ میری پڑوسن کھڑکی کے پاس محض ایکلی کھڑی تھی۔ میں نے اس دن آسمان کی طرف ٹکٹکی بندھی ہوئی اشکبار آنکھیں دیکھیں۔ ان میں خیالات کا طوفان اور جذبات کا ہجوم پوشیدہ تھا۔ اور التجا بھری نگاہیں۔ آسمان پر تھرتھرتی ہوئی بجلی کی لہروں پر رقصاں میں !

مجھے یقین ہو گیا کہ آج میرے پڑوسی کے دل میں کس قدر بجلی مچی ہوئی ہے۔ وہ کسی نہ ہونے والے کی یاد میں اپنا دل ترپا رہی ہے۔ دیوتا کے لئے انسان نہیں ہے۔ مگر انسان کے لئے دیوتا ضرور ہے۔

اس کی دونوں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بے بسی۔ اس دن کی آندھی
سے گھبراتے ہوئے پرند کی طرح اڑی جا رہی تھی۔ مگر کہاں !
”میرے دل کے گھونسلے کی طرف“؛

اُس دن کے بعد میں اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ اُس وقت
کسی دوسرے کی نظم کی درستگی میں راحت نہ ملی کسی نہ کسی طرح کے
دوسرے کام کو کرنے کو دل بے چین سا ہونے لگا۔

تب میں نے اپنے شہر میں ”بیواؤں کی شادیاں“ کرانے کی
قسم کھالی ! بڑے لیکچروں اور تحریروں سے نہیں۔ بلکہ اس نیک اور کار
ثواب کے لئے میں نے نہ صرف کرنے کا بھی ارادہ کر لیا۔۔۔ مسمم
اور اٹل !

کشتور مجھ سے بخت کرنے لگا۔ کہ دل کے اندر جذبہ عشق نہیں
ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے۔ تو دل کو سکون سا ملتا ہے۔ مگر شادی کا
خیال آ جانے سے ہی وہ دلی سکون غایب ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی باتیں سن کر مجھے غصہ آ جاتا ہے۔ جو لوگ تقدیر کے
تھیڑوں سے پٹے جا چکے ہیں اور نان شبیہ تک کے محتاج ہیں۔ اُن
کے سامنے اگر کوئی شخص کھانے کی چیزوں کے ہرے انہیں بچھو لوں
کی خوشبو اور پرندوں کے گانوں سے اُن کا پیٹ بھر دینا چاہے۔ تو

کہاں تک کامیابی ہوگی۔

میں نے غصّہ سے کہا۔ ”دیکھو کشور! مصّور لوگ کہا کرتے ہیں کہ جلتے ہوئے مکان کا نظارہ بڑا ہی قابل دید ہوتا ہے مگر گھر کے صرف نظارہ ہی کو اکیلے نہیں دیکھا جاتا۔ اس میں رہائش رکھنی پڑتی ہے مصّور جو کہیں سو کہیں۔ مگر گھر کی مرمت کرنا ضروری ہے۔ تو تم بیوگی پر صرف نظمیں ہی لکھنا چاہتے ہو۔ مگر تمہیں کیا معلوم کہ اس میں ایک مَرّجھایا ہوا دل اپنی بے بس خواہشات کو لئے ہوئے چھپا بیٹھا ہے۔

میں نے سمجھا تھا کہ کشور میرے خیالات کے خلاف ہو گا اور اسی لئے میں نے اُس دن اُس سے بڑے جوش سے گفتگو کی تھی۔ لیکن میں غلطی پر تھا۔ کشور میرا ہیناں نکلا۔ اُس نے صرف ایک ہی گہری سانس لے کر میری سب باتوں کے آگے سر جھکا دیا۔ اور میرے دل میں ان کے لئے جو خیالات تھے۔ ان کو ظاہر کرنے کا موقع دیئے بغیر ہی چلا گیا۔

دس دن گزر گئے۔ ایک دن کشور نے آکر کہا۔ کہ اگر تم میری امداد

کردو۔ تو میں خود ایک بیوہ سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔“

یہ سن کر میں خوشی سے دیوانہ سا ہو گیا۔ کشور کو محبت سے گلے لگا کر کہا۔ ”جو خرچ ہو گا۔ میں خود اپنی جیب سے دوں گا۔ اس کے بعد کشور نے سب قصّہ سُنا دیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ کشور کسی خیالی بیوہ پر ہی نہیں

بلکہ ایک زندہ حسین۔ پُرسرا اور باحیا عورت پر فدا ہے۔ اور یہ بات اب تک پرودہ راز میں پوشیدہ تھی۔ کشور نے ابھی کسی پر ظاہر نہیں کی تھی۔ جن ماہواری اخباروں میں کشور کی۔۔۔ میری نظمیں شائع ہوئی تھیں۔ وہ جیانی کچا ہتے۔ پہنچ جاتیں۔ وہ نظمیں ضائع نہ گئیں۔ بغیر ملاحظات کے یہ دودل ملنے کا طریقہ کشور نے خوب نکالا تھا۔

کُشور کا کہنا ہے کہ اُس نے کسی قسم کی بد اخلاقی یا چالاکی نہیں کی۔ بلکہ اُسے یقین تھا کہ وہ بیوہ بالکل غیر تعلیم یافتہ تھی۔ اس کے بھائی کے نام مفت ہی کئی ماہواری اخبار بھیجے شروع کر دیئے۔ اسی سے اس کے دل کو تسلی ملنے لگی۔ انہیں بھیجنے کے وقت کشور یہ سوچا ہوگا۔ کہ میں کسی دیوتا کو بھول چڑھا رہا ہوں۔ اس کا بھلے یا نہ ملے۔

کُشور نے اُس کے بھائی کے ساتھ بھی دوستی کر لی۔ اور اس نے کہا تھا۔ کہ اس دوستی میں اس کا خاص مطلب نہ تھا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جس کو محبت کی جاتی ہے۔ اس کی ہر چیز سے اُس ہو جاتا ہے۔ اسے آپ کشور کی خوش فہمی کہیں کہ اس حسینہ کا بھائی بیمار پڑ گیا۔ بیماری کچھ معمولی نہ تھی۔ موذی دق نے آدبا یا تھا۔ مہینوں بستر پر پڑا رہا۔ چونکہ کشور اس کی بیمار پرہی کو جاتا تھا۔ اس لئے اس کی بہن سے بھی گفتگو ہونی شروع ہو گئی۔ کشور چونکہ صاف دل تھا۔ اس لئے وہ اس سے

شاعری کے متعلق بحث کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ راز افشا ہو گیا۔ جو اخبار اس کے ہاں آتے ہیں۔ وہ کشور ہی کی ہر بانیوں کا نتیجہ ہے۔ ایک دن بحث مباحثہ میں کشور اس سے شادی کا تذکرہ کر بیٹھا وہ پہلے تو کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ مگر جب کشور نے گراموفون کی طرح مجھ سے سنی ہوئی ساری تدبیر استعمال کر ڈالیں اور دو چار آنسو بھی بہائے۔ تو آخر اس کو ماننا ہی پڑا۔ اب بیوہ کے سسرال والے کچھ روپیہ چاہتے تھے۔ جس سے کہ اس کی شادی کا خرچ چل سکے۔

میں نے کہا۔۔۔ روپیوں کی کیا فکر ہے۔ ابھی بے جاؤ۔ پھر کشور کچھ دیر بعد بھیدگی سے بولا۔ ”اُس کے علاوہ میرے پتا جی مجھے جو خرچ ہر ماہ دیتے ہیں۔ وہ بھی شادی کے پانچ چھ ماہ بعد تک بند ہی رہے گا۔ اس لئے اس عرصہ تک ہم دونوں کے اخراجات بھی تمہیں کو برداشت کرنے پڑیں گے۔ میں نے بغیر کچھ خیال کئے ایک چیک کاٹ کر اس کے حوالے کر دیا۔ اور کہا۔

تمہیں جتنے روپیوں کی ضرورت ہو۔ تم بغیر کسی خیال کے بینک سے نکال سکتے ہو۔ مگر سبھی تم اس دیوی کا نام تو بتلا دو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس کا نام کبھی نظم میں نہ لاؤں گا۔ اور اگر کبھی لکھ بھی دیا۔ تو وہ اس کے بھائی کے پاس نہ بھیج کر تمہارے پاس بھیجوں گا۔

کُشور نے کہا۔ ”میں اس سے نہیں ڈرتا۔۔۔ بھائی وہ بیوہ شادی

سے بہت ہی شرمندہ ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم کو اس کا نام نہ بتاؤں۔ مگر اب چھپانا فضول ہی ہے۔ وہ تمہاری ہی پڑوسن ہے اور ۲۱ نمبر کے مکان میں رہتی ہے۔

اگر میرا دل لوہے کا بائیلہ ہوتا تو اسی دھکے سے جھٹ پھٹ جاتا۔ کچھ دیر بعد خود کو سنبھال کر میں نے کہا۔ کیا ”بیوہ شادی“ وہ پسند کرتی ہے؟ کثور نے ہنس کر کہا۔ ”ہاں بھائی۔ اس وقت تو رضا مند ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”صرف نفیس پڑھ کر ہی وہ تم کو دل دے بیٹھی؟“ کثور نے جواب دیا۔ ”کیوں میری وہ نفیس کیا کچھ کم اثر رکھتی تھیں؟“

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ تم خوش نصیب ہو۔ اور اپنے شعلہٴ الفت کو دبانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتشِ غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے !

شعله آتش

افسانه نمبر ۲

آدرش بھارت

جہاں قلب خوف سے آشنا نہیں اور سر اُونچا رہتا ہے۔

جہاں علم آزاد ہے۔ جہاں دُنیا خانگی دیواروں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ نہیں ہو گئی۔

جہاں الفاظ سچائی اور صداقت کی گہرائی سے نکلتے ہیں۔ جہاں مستقل سوشل اپنے لمبے باز و تکمیل کی طرف بڑھاتی ہے۔ جہاں عقل و ادب کا شفاف آئینہ رسم و رواج کی خشک ریتی زمین میں بر باد نہیں ہوا۔

جہاں تخیل علم و ادب کی طرف راغب کرتا ہے۔

اے مالک! میرے بھارت ورثہ وراثت کو بیدار کر۔



شعلہ آتش

چوری اور وہ بھی شاہی خزانہ میں۔

چشم زدن میں یہ خبر شہر میں جگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر ایک زبان پر اس کا ذکر سب جدھر جاؤ۔ یہی باتیں۔
 ”اگر چور گرفتار نہ ہو۔ تو محافظ خزانہ کی خیر نہیں۔“
 ”چور بھی بڑا ہی چالاک ہو گا۔“

”اور ساتھ ہی دلیر بھی۔“

”شاہی خزانہ میں چوری اس بات کا ناطہ ہر اثبوت ہے۔“
 ”چور ضرور گرفتار ہونا چاہیے۔“

یہ تھیں باتیں جو بگلی کی تیز رفتاری سے ایک زبان سے دوسری زبان پر اور دوسری زبان سے تیسرے کان میں پہنچ رہی تھیں۔

کلدیپ ————— نوجوان تھا۔ خوبصورت تھا۔ سڈول جسم تھا۔ مگر اس شہر میں اجنبی تھا۔ کسی غیر ملک سے یہاں گھوڑوں کے بیوپار کے لئے وارد ہوا تھا۔ مگر راستہ میں ڈاکوؤں نے تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ وہ بے چارہ پردیسی ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔ اور اب ایک خستہ مندر میں جو شہر کے باہر چند قدم کے فاصلہ پر واقع تھا۔ پڑا تھا۔ اس مندر کو تعمیر ہوئے شاید ایک ہزار سال ہو گیا ہو۔

دو پہر ہو چکی تھی۔ بادشاہ کے سپاہی چور کی تلاش میں یہاں بھی آ پہنچے۔ اور آخر کلدیپ کو چوری کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور تہکڑی پہنا کر جیل کی طرف روانہ ہوئے۔

پتہ پتہ ایک حُسن فروش حینہ بازار حُسن میں بیٹھی ہوئی راہ گروں کے دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ اور عالمِ خواب میں مدہوش اس کی ہر ادا پر سینکڑوں دل مجروح ہوتے تھے۔ اس کے ایک ایک لفظ پر ہزاروں زبانیں بند ہوتی تھیں۔

آج بھی وہ اپنے بالا خانے کی کھڑکی میں جلوہ گر تھی۔ اُس کی

نکا ہیں راستہ پر تھیں۔ جیسے کوئی غیر فی ٹسکار کی تلاش میں ہو۔ مگر یکایک وہ لہڑاٹھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے اسی وقت باندی کو بلایا اور دریافت کیا ”وہ کون ہے؟“

”مجھے کیا معلوم۔۔۔ بھگوان ہی بہتر جانتے ہیں۔“

”جاؤ۔۔۔ اور میری زبان سے ان سپاہیوں کو کہو کہ اس قیدی کو میرے پاس لاؤ۔ جاؤ دیر کی حاجت نہیں۔“

ملازمہ چلی گئی۔ چند منٹ بعد سپاہی قیدی کو لے کر حاضر ہوا۔ اور بولا۔

”حسن کی ملکہ، تم غلطی پر ہو۔ اور یہ اس وقت درخواست بھی نامناسب ہے۔ کیونکہ میں نے قیدی کو بہت جلد شاہی حضور میں حاضر کرنا ہے۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا۔ تو خود میری شامت آٹے گی۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں۔“

کیونکہ اس وقت تمہاری طرف خیال نہیں کر سکتا۔“

کلدیپ نے سراٹھایا۔ اور پدمنی کی طرف دیکھا۔ اور پھر نگاہ نیچی کر کے کہنے لگا۔

”میں نہیں سمجھتا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے۔ کہ آپ کسی شخص کو۔۔۔“

راہ چلتے مسافر کو بلا کر اس کا مذاق اڑائیں۔ اپنے رُعبِ حسن میں شاید آپ سب کچھ روا سمجھتی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ انسانیت سے بعید ہے۔“

”مذاق!۔۔۔ اور آپسے! آپ غلطی پر ہیں۔ میں بخوشی ان طلائی
چوڑیوں کی جگہ آپ کی یہ آہنی زنجیر پہننے کو تیار ہوں۔“
مگر ان تمام باتوں کا جواب قیدی نے کچھ نہ دیا۔ آخر پدہنی نے
سپاہی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اے شاہی قانون کے علمبردار! نیک سیرت انسان! امیں اپنی
خوشی۔ آرام۔ چین۔ راحت۔ حسرت۔ دولت۔ عزت۔ یہاں تک کہ زندگی
تک تیرے قدموں پر نثار کرنے کو تیار ہوں۔ اور اس کے عوضانہ میں
صرف ایک تہ تم سے منوانا چاہتی ہوں۔ کیا مانو گئے؟“
”پہلے اقرار نہیں کر سکتا۔۔۔ شاید۔“

”صرف اس بے گناہ شخص کی رہائی چاہتی ہوں۔ اور اس کے بعد میرا
سب کچھ تیرا ہوگا۔“

”نہیں! مہربان قانون۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر یہ ہو گیا۔ تو
مجھے بادشاہ کے غصے کی آگ میں بھسم ہونا ہوگا۔ اُس غصے کو سرد کرنے
کے لئے یہ لازمی ہے کہ قیدی حاضر حضور کیا جائے۔“

”تو کیا ڈو تین دن کی مہلت بھی نہیں مل سکتی؟ یہ اشرفیائی تہا رسی نذر
سپاہی نے پہلے تو کچھ سوچا۔ پھر زیر لب مسکرایا اور کہا۔
”خیر تو نہیں سہی۔“

قیدی کو تار یک کو ٹھٹھری میں دو دن اور دو راتیں گزر گئیں دُورِ مری
 شب کو اُس نے بھگوان سے پرار تھنا کی اور ایک پھیٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھ
 کر وقتِ آخر کی انتظار کرنے لگا۔ یکا یک دروازہ کھل گیا۔ ایک عورت
 ہاتھ میں روشنی لئے۔ چہرہ گھونگٹ میں چھپائے ہوئے داخل ہوئی۔ اس
 نے سپاہی کو کچھ اشارہ کیا۔ اور اس نے آگے بڑھ کر قیدی کی زنجیریں کھول
 دیں۔ قیدی چشمِ حیرت سے کبھی سپاہی۔ کبھی قانون اور کبھی اپنی طرف دیکھتا
 تھا۔ آخر اس نے کہا۔

”اے نیک طبع عورت! میں تیرے احسان کو عمر بھر فراموش نہیں کر
 سکتا۔ تیرا شبِ تاریک میں روشنی لے کر داخل ہونا۔ میری صبحِ زندگی
 کی نشانی ہے۔“

پدمنی نے ایک فلک بوس قہقہہ لگایا اور ہنسی اور غُوبِ ہنسی۔ یہاں
 تک کہ اس کی چشمِ آہو سے آنسو رواں ہوئے۔ اور اس نے آنگوں آنکھوں
 اور لڑزتی ہوئی زبان سے کہا۔

”میں اور رحمِ دل۔ مجھ سے بے رحم شائد کوئی جلا دہی نہ ہوگا۔“
 یہ کہا اور قیدی کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی۔ پدمنی اور کلید کے
 پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔

صبح کے وقت جانبِ مشرق سُرخ چھائی ہوئی تھی۔ آفتاب اپنی سنہری کرنیں سطحِ آب پر پھیلا رہا تھا۔ پانی جگمگا رہا تھا۔ لبِ ساحل ایک کشتی کھڑی تھی۔ پدمنی نے قریب ساحل پہنچتے ہوئے کہا۔
 ”نوجوان اجنبی آؤ۔ کشتی میں بیٹھو۔ یہ تمہیں اچھی طرح یاد رہے کہ میں نے ہی تمہیں اس کال کو ٹھہری سے نکالا ہے۔ اور اب بندریہ کشتی تمہارے ساتھ عازمِ سفر ہوں۔“

کشتی بڑی تیزی سے دریا کی لہروں کو چیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ سورج دیوتا ہر لحظہ اُونچا ہو رہا تھا۔ پرندے اپنے پُر سہرا گ سے آسمان میں ترنم پیدا کر رہے تھے۔ کلدیپ نے پدمنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔
 ”اے پُراسرار حسینہ! اے میرے دل کی ملکہ! تمہارے کتنے رویہ نے مجھے آزادی دلائی ہے۔“

”ابھی نہیں۔ وقت خود بتا دے گا۔“

صبح سے آہستہ آہستہ دوپہر ہونے لگی۔ گاؤں کی نوجوان لڑکیاں اُشان کر کے سروں پر پانی کے برتن رکھے۔ گھروں کو واپس جا رہی تھیں۔ آمدورفت کم ہو گئی تھی۔ پگڈنڈی پر آفتاب کی منور کرنیں محوِ نقس تھیں۔ ہوا کے ایک گرم جھونکے نے پدمنی کے چہرے سے گھونگٹ ہٹا دیا۔۔۔
 کلدیپ نے آہستگی سے کہا۔

”پدمنی! تم نے مجھے رہائی تو دلائی ہے۔ مگر کس طرح؟۔۔۔
اب تمہاری اس مستقل قید سے رہائی کس طرح دستیاب ہو سکتی ہے؟
حسینہ نے اپنے گھونگٹ کو درست کیا اور جواب دیا۔
”ابھی وقت نہیں۔“

شام ہوئی۔ سورج غروب ہو گیا۔ ہر جانب تاریکی مسلط تھی آسمان
پر ستارے جھل جھل کر رہے تھے۔ ماہِ کامل نے اپنی نورانی سرکڑوں
سے سطحِ آب کو روشن کر دیا۔ ستارے ندی میں ڈبکیاں لگانے لگے۔
ہر جانب خاموشی تھی۔ بالکل خاموشی۔ پدمنی، کلدیپ کے بازو کا
سہارا لئے محو خیال تھی۔ اس کی سیاہ عنبرین زلفیں شب کی اس
سیاہی کو دوبالا کرنے میں مصروف تھی۔ دُور جنگل سے ہوتے ہوئے ہوا
کے مشکبار جھونکے محو خرام تھے۔ آخر حسینہ رکتے ہوئے گلے سے بولی۔
”میرے دل کے مالک! جو کچھ میں نے کیا۔ وہ واقعی ناممکنات
میں شامل تھا۔ مگر اس کا نوکِ زبان پر آنا ناممکن نہیں۔۔۔ مگر پھر
پھر بھی مختصر طور پر سُنا تی ہوں۔ وہ بد بخت شاما چرن تھا۔ جس نے خود
پر الزام بھرم لیا اور صرف میری خاطر اور محض میری خاطر اپنی عزیز اور
قیمتی جان کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھیل دیا ہے۔ پروانک نہ کی۔

اُف تک زبان پر نہ لایا۔۔۔۔۔ پر یتیم میرے اس گناہ کی۔ میرے
اس ناقابلِ مُعاف جرم کی وجہ صرف تمہاری اُلفت۔ تمہاری کشش تھی۔
۔۔۔۔۔ بس۔“

اس دوران میں غور شد خطۂ عالم کی پُتر اسرارِ دل چسپی اور سحر کار
حُسن سے لطف اندوز ہو کر بادلوں کی آڑ میں چھپ چکا تھا۔ جنگل کی
خاموشی اور شب کی سیاہی میں ہر قدم پر اضافہ ہو رہا تھا۔

آہستہ۔ آہستہ۔ کلدیپ کا بازو نوجوان حید کی کمر سے الگ
ہو گیا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ ایک خاموش پتھر کے بُت کی
طرح ایک طرف بیٹھا تھا۔ چٹم زدن میں پدمنی اس کے پاؤں پر گر پڑی۔
اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

”میرے بھگوان مجھے مُعاف کر دو۔ اور میرے اس جرم کی سزا کا
فیصلہ عالم کے بھگوان پر چھوڑ دو۔“

”میری یہ ناپائیدار زندگی ایک خوفناک گناہ کے بدلے میں لی
گئی ہے۔ لعنت ہے مجھ پر اور میری اس زندگی پر۔“

”وہ بکا یک کشتی سے کود پڑا۔ اور تیر کر کنارے کی طرف آیا۔
مگر ساحل پر ٹھہرا نہیں۔ اور جنگل کی طرف چل پڑا۔ اتنا چلا کہ آخداستہ
بند ہو گیا۔ اور مقابل درختوں اور طخوار نوکیلے پودوں نے کمرے

ہو کر اُسے ختم کر دیا۔ وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ وہیں زمین پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ ہراساں تھا۔ خاموشی۔ تاسکی اور خوف نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔

”راستہ میں کون میرا تعاقب کر رہا تھا؟“

یہ خیال تھا۔ جو رہ رہ کر اُس کے دماغ میں پیدا ہوتا اور اس کی پریشانی میں امانہ کرتا تھا۔ اُس نے سر اٹھایا اور کمرخت لہجہ میں بولا:-

”کیا تم میرا چھپا نہ چھوڑ دو گی؟“

حبیبہ اس کے سامنے دوڑا نو ہو گئی۔ اب اس کے پکھرے ہوئے بال اُس کے ریشمی دامن میں پوشیدہ تھے۔ اس نے اشکبار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے لہر زنی ہوئی زبان سے کہا:-

”اب میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ محض تمہاری خاطر مرتکب

گناہ ہوئی۔ اور اب تمہیں کیسے چھوڑ دوں؟ ہاں اگر تم میری جان لینا چاہتے ہو۔ تو اپنے پوتر ہاتھوں سے مار ڈالو۔ اس طرح سناستا کر مارنا۔ کیا تمہیں واجب ہے؟“

جنگل کی خوفناک خاموشی ایک سانس کے عرصہ تک لہری۔

دورخوں کے زمین میں پوشیدہ تنوں میں ایک خوف طاری ہو گیا۔

ہو امیں ایک دہشتناک خونِ منجمد کر دینے والی چنچ گونجی اور ساتھ ہی ایک گرم لاش بکھر ہوئے خشک پتوں پر آگری۔

صبح ہوئی۔ کلدیپ جنگل کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ وہ میدان میں داخل ہوا۔ اُس وقت سورج دُور ————— بہت دُور بہت ایک دیو مندر کے کس پر اپنی زرنگار کبرنوں کی دولت بکھیر رہا تھا۔

کلدیپ پریشانی کی حالت میں تمام دن دھوپ میں ادبر اُدھر پھرتا پھرتا رہا۔ ————— شام ہوئی ————— بے خیال۔ بے ارادہ۔ کشتی کے پاس پہنچا۔ لب ساحل ایک پازیب پڑی تھی۔ اس نے اُسے اُٹھا لیا۔ ایک بار اچھی طرح دیکھا۔ پھر چھاتی سے لگا لیا۔ دل سے ایک ہوک اُٹھی۔ دل زخمی ہو گیا۔ اوندھے منہ پاس پڑے ہوئے ایک سیاہ لبادے پر گر پڑا۔ اس وقت پدمنی کا حسین چہرہ اس کے پیشِ نظر تھا۔

سورج غروب ہوا۔ شام ہوئی۔ اور شب کی خاموش فضا آہستہ آہستہ پرندوں کی آواز میں بدل کر تاریک ہو گئی۔ چاند دُور درختوں کے جھنڈ کے پیچھے غائب ہو گیا۔

کلدیپ اُٹھا۔ آنگوٹوں آنکھوں سے جنگل کی طرف دیکھا۔ بازو

پھیلا دیئے۔ اور دیوانوں کی طرح چلتا یا۔۔۔۔۔ ”پیارے۔۔۔۔۔
میرے پاس آ۔“

پر بھات کی نامکمل روشنی میں ایک متحرک سایہ لب ساحل کھڑا تھا۔
آخر اُس نے نوجوان کی طرف دیکھا اور کہا۔

”پیارے! میں آگئی ہوں۔ آپ کے حسین ہاتھ مجھے مار ڈالنے میں
کامیاب نہیں ہوئے۔ بس میری سزا اب یہی کافی ہے۔ کہ میں
زندہ ہوں۔“

یہ کہتے کہتے پدمنی کلدیپ کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ نوجوان کے
چہرے پر ایک بار خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ہاتھ پھیلائے اس کی طرف
بڑھا مگر فوراً ہی جس طرح کوئی سانپ دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے۔ اس
طرح کچھ یاد آنے کے بعد اس نے ہاتھ کینچے لئے اور بولا۔

”اُف تم کیوں آگئیں؟۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ!“

پھر اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ مُنہ دوسری طرف پھیر
لیا اور بھڑائی ہوئی آوازیں کہا۔

”جاؤ! چلی جاؤ! اور مجھے اپنے حال پر رہنے دو۔“

وہ چند سیکنڈ بے حس و حرکت کھڑی رہی اور اب پھر آخری بار اس
کے پاؤں پر جھک گئی۔ اور پر نام کے ساتھ ہی اپنے پیارے کے پاؤں

آنسوؤں سے دھو دینے پھر بغیر سچھے دیکھے۔ وہ ایک آہ کی طرح
جنگل میں جا کر غائب ہو گئی۔

کل دیپ ایک جلتا ہوا دل۔۔۔۔۔ شعلہ آتش پہلو میں ہے
ہوئے کشتی میں بیٹھ گیا۔

شعله کدورت

افسانه نمبر ۳

نغمے !

اس دفعہ اپنی کشتی کو میں سمندر میں دھکیل دوں گا۔ ساحل پر کھڑے
کھڑے میرا وقت فضول گزرتا رہا ہے۔ حیرت ہے مجھے پر۔

موسم بہار ختم ہو چکا ہے۔ اور خزاں زحمت ہو رہی ہے۔ مگر میں ابھی
تک مرجھائے ہوئے پھولوں کے بار سے دبا کھڑا ہوں۔

لہریں ساحل سے ٹکرا کر پرتھور ہو گئی ہیں۔ اور کنارے پر سایہ دار راستے
میں زرد پتیاں اڑ کر گر رہی ہیں۔

کس ویرانے کی طرف تم دیکھ رہے ہو۔ کیا تم ہوا میں پھلتے ہوئے نغموں
کو محسوس نہیں کرتے؟ جو دہرائی گینوں سے مل کر ایک کنارے سے دوسرے
کنارے تک پہنچ رہے ہو۔

شعلہ کدورت

زمیندار کے نائب کیدار ناتھ کے گھر سیتا ایک براہمنی کھانا بنانے کے لئے لو کر ہوئی۔ کم عمر تھی۔ خوبصورت تھی۔ نیک اور آئینہ چلن تھی۔ دونوں وقت پوجا پاتھ کرتی۔ کہیں دور کی رہنے والی وہ براہمنی بوجہ عزت مصیبت کے چنگل میں پھنس کر کیدار ناتھ کے ہاں کھانا بنانے کے لئے آ رہی۔ ایک دن مالک کی بُری نظر سے اپنے کو بچانے کے لئے اسے بہو کے سامنے دوزانو ہو کر رونا پڑا۔ بہو نے نہایت نرم اور شفقت آمیز الفاظ میں کہا:-

”سیتا! تم یہاں سے اپنی عزت بچا کر چلی جاؤ۔ کہیں اور لو کر رہی

کر لو۔ یہاں تمہارا رہنا ٹھیک نہیں۔“

لیکن سینا کے لئے وہاں سے بھاگ جانا آسان نہیں تھا۔ پاس کوئی خاص رقم بھی نہ تھی۔ ہونگے ہی چار پانچ آنے کے پیسے۔ بیچاری جاتی بھی تو کہاں۔ آخر اسی گاؤں میں دوار کا داس بھٹ کے ہاں جا کر نوکری کر لی۔ اور اُن کو اپنا تمام سابقہ قصہ بھی سنا دیا۔ دوار کا داس بڑے شریف۔ رحم دل اور غریب پرور انسان تھے۔ انہوں نے اسے نہایت ہربانی سے اپنے گھر میں جگہ دی۔ اُن کے لڑکوں نے کہا۔

”آپ ناحق مصیبت کو اپنے گھر بلا رہے ہیں۔“

”اگر کوئی مصیبت زدہ خود آ کر میرے سہارے کا سوا لی ہو۔ تو میں

اسے دھکا دیکر نکال دینا نہیں چاہتا۔“

اُن کے الفاظ میں استقلال اور رحم کی جھلک جھلک رہی تھی کیونکہ دوار کا داس کی فطرت نیک تھی۔ اس لئے اس نے جواب دیا۔

چند دن بعد۔۔۔ دوپہر کے وقت دوار کا داس اپنی بیٹھک میں بیٹھ ہوئے کاغذات دیکھ رہے تھے۔ کہ کیدار ناتھ داخل ہوا اور بولا۔۔۔

”آپ نے ہماری براہمنی کو اپنے ہاں لو کر رکھ لیا ہے ؟

گھر میں کھانا بنانے والے کے بغیر بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“

اس کے جواب میں بھٹ جی نے دو چار سچی باتیں کہہ سنائیں۔ وہ

نیک دل تھے اور سچے آدمی تھے۔ کسی کی عزت رکھنے کے لئے بات گھما بھیر کر کہنے کی انہیں عادت نہ تھی۔

نائب صاحب یہ باتیں سن کر دل میں کہنے لگے۔ چوہنیٹ کے بھی پر نکل آئے ہیں۔ اب اس کی خیر نہیں۔ پھر وہ جانے کے لئے تیار ہوئے اور بڑے زور سے مسکار کیا۔

ایک ہفتہ کے بعد بھٹ جی کے ہاں پولیس آئی۔ اُن کی عورت کے تکیہ کے نیچے سے کیدار ناتھ کی بیوی کے چند زیورات نکلے۔ براہمنی چور ثابت ہوئی۔ اور جیل بھیج دی گئی۔ بھٹ جی چونکہ مشہور اور باعزت آدمی تھے۔ اس لئے چوری کے مال کو رکھنے کے جرم سے بال بال بچ گئے۔ مگر ان کو یقین ہو گیا کہ میرے گھر نوکری کرنے سے ہی براہمنی کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اُن کے دل میں یہ بات کانٹے کی طرح کھسکنے لگی۔ لڑکوں نے کہا۔

”گاؤں چھوڑ کر اب کہیں اور چلئے۔ اب یہاں رہنا مناسب نہیں
 ”میں جدی مکان چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاسکتا۔ جو تقدیر میں
 ہوتا ہے۔ وہ ہو کہ ہی رہتا ہے۔ خواہ کہیں بھی چلے چلیں۔ مصیبت
 کہاں نہیں آسکتی؟“

کچھ دنوں بعد نائب نے زمین کا لگان بڑھانے کی کوشش کی

جس سے کسانوں نے بہت شور و غل کیا۔ بھٹ جی کے پاس جتنی زمین تھی۔ وہ انہیں بطور خیرات ملی تھی۔ اس سے زمیندار کا کوئی تعلق نہ تھا۔ نائب نے اپنے مالک سے کہا۔

”بھٹ جی۔ کسانوں کو اُکسا رہے ہیں“

زمیندار نے جواب دیا۔ ”جس طرح ہو۔ بھٹ جی کو نیچا دکھانا چاہئے“
نائب پھر بھٹ جی کے پاس آیا اور نسکار کر کے بولا۔

”شریمان جی کی یہ زمین ہماری سرحد میں پڑتی ہے۔ اس نے اُسے آپ کو چھوڑنا پڑے ہو گا“

”آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ وہ زمین تو بہت دنوں سے میرے پاس ہے“

بھٹ جی کے گھر سے ملی ہوئی زمین کے لئے زمیندار کی طرف سے نامش ہوئی۔ بھٹ نے سوچا۔ زمین چاہے چلی جائے۔ مگر میں بڑھاپے میں عدالت کا منہ نہ دیکھوں گا۔ لڑکوں نے کہا۔

”اگر آپ زمین چھوڑ دیں گے۔ تو اس گھر میں کیسے رہیں گے؟“

لڑکوں کے اصرار اور باپ دادا کے گھر کی محبت سے مجبور ہو کر بھٹ جی عدالت میں گئے۔ منصف صاحب نے صرف انہی کی گواہی پر مقدمہ خارج کر دیا۔ بھٹ جی کی زمین کے کاشتکاروں نے اس جیت پر بڑی

خوشیاں منائیں۔ مگر بھٹ جی اس کے خلاف تھے۔ زمیندار کے دماغ میں شعلہ کدورت بھڑک اُٹھا۔ نائب صاحب نے مقدمہ ہائی کورٹ میں چلا دیا۔ سب وکیل لوگ بھٹ جی سے کہتے تھے۔ کہ اس مقدمہ میں جیت آپ کی ہی ہوگی۔ کیا دن کبھی رات ہو سکتا ہے ؟ ایک دن نائب کے ہاں بڑی دُصوم دھام سے محفل ہوئی۔ شہر سے طوائفیں بھی بُلائی گئیں۔ بھٹ جی کو اُن کے وکیل سے پتہ چلا۔ کہ وہ مقدمہ ہار گئے ہیں۔ اسی لئے نائب کے ہاں جشن منایا جا رہا ہے۔ بھٹ جی نے ماتھا پیٹ کر۔۔۔ وکیل سے پوچھا:-

”آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟۔۔۔ میری کیا حالت ہوگی ؟“
 دن کس طرح رات ہو گیا ؟ اس کا مطلب وکیل صاحب نے یوں سمجھا یا کہ حال میں جو جج ہو کر آئے ہیں۔ اُن کی پہلے مُنصف صاحب سے کھٹ پٹ تھی۔ اُس وقت تو ان کا اختیار نہ تھا۔ مگر اب چونکہ مقدمہ ان کے اجلاس میں تھا۔ اس لئے آپ کے خلاف کر دیا ہے۔ بھٹ جی نے کہا۔ ”تو کیا بڑی عدالت میں بھی اس کی کچھ سُنانی نہ ہوگی ؟“
 وکیل صاحب نے کہا۔ ”جج صاحب نے ایسا فیصلہ لکھا ہے کہ وہاں جانے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“

آنکھوں میں آنسو بھر کر بھٹ جی بولے۔۔۔ ”تو میرے گھریار کا

کیا ہو گا؟ ان کی آواز لرز رہی تھی۔

وکیل نے بہت ہی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا: ”داب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ معاملہ بگڑ گیا ہے۔ کسی کے بس کی بات نہیں رہی۔“

دوسرے دن نایب بری شان و شوکت سے بہت سے آدمیوں کو ساتھ لے کر بھٹ جی کے ہاں گیا۔ بھٹ جی کو پر نام کر کے کہا: ”آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ وہی ہوتا ہے۔ جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔“

بھٹ جی اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکے اور ٹریک کر جان دیدی نائب مسکراتا ہوا چلا گیا۔

بھگوان! کیا شعلہ کدورت اتنا خوفناک اور خطرناک ہوتا ہے؟

شعلهٔ نفس

افسانهٔ نمبر

نقلی اجکار

تم جس بچے کو راجکار۔ کے لباس میں ملبوس کر رہے ہو جس کے گلے میں ہار پہنا رہے ہو۔ اس سے اس کے کھیل کی تمام مستیوں برباد ہو جاتی ہیں۔ اسے اس کا لباس ہر قدم پر اس کو الجھا دیتا ہے۔ اور چلنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

اس خوف سے کہ کہیں رگڑ نہ لگ جائے۔ یا خاک سے داغدار نہ ہو جائے۔ وہ اپنے کو سب سے دور علیحدہ رکھتا ہے۔ اور حرکت کرنے سے خوف کھاتا ہے۔

اے ماں! یہ سب فضول ہے۔ کیوں کسی کو زمین کی مروت خاک سے علیحدہ ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر وہ ایک ظاہرہ تماشہ گاہ حیات انسانی کے میں داخل ہونے کے حق کو کسی سے چھین لیتی ہے۔

سُعلۂ نفس

دیو پور کے زمیندار گویا تھا۔ اپنے بڑے لڑکے کو سب زمینداروں اور گھربار سنبھال کر تیرتھ یا تراکرنے چل نکلتے۔ نرم دل اور ہر دلعزیز تھے۔ اس لئے سب لوگ انہیں سیشن تک چھوڑنے آئے۔ تمام ان کی جدائی کو محسوس کر رہے تھے۔

ان کے لڑکے چمن لال پڑھے لکھے جوان تھے۔ تعلیم شاڈبی۔ لے تک پانی تھی۔ لمبا قد۔ سڈول جسم۔ سر کے بال انگریزی فیشن کے کٹے ہوئے اور آنکھوں پر چٹمہ تھا۔ وہ زیادہ گفتگو سے پرہیز کرتے تھے۔ کھانے پینے میں بھی اتنے پرہیزگار تھے کہ تنباکو تک نہ پیتے تھے۔

یہ سب خوبیاں ہوتے ہوئے بھی وہ تیز مزاج تھے۔ اُن کے کاشتکاروں کو جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ وہ کس مزاج کے مالک ہیں۔ بوڑھے مالک لین دین میں نرم تھے۔ مگر یہ نئے مالک ایک پیسہ بھی نہ چھوڑتے تھے۔

کام کی چھان بین سے چمن لال کو معلوم ہو گیا۔ کہ بہت دنوں سے براہمنوں کے پاس بغیر لگان کے زمین پڑی ہے۔ اور بہت سے کاشتکاروں کو کم لگان پر زمین دی ہوئی ہے۔ کوئی ناٹھ سے اگر کوئی سوال کرتا۔ تو وہ اسے بغیر پورا کٹے نہ رہتے تھے۔ یہ اُن میں ایک کمزوری تھی۔

چمن لال نے سوچا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ آدھی زمین بغیر لگان کے ہی دیدی جائے۔ انہوں نے دو باتیں سوچیں۔ ایک یہ کہ جو نکتے گھر میں بیٹھے بیٹھے بغیر کسی محنت کے ہی مُنافع کھا رہے ہیں۔ وہ کسی رحم یا خیرات کے مستحق نہیں۔ اس قسم کی خیرات انسان کو کاہل اور سُست بناتی ہے۔

دوسرے یہ کہ اُن کے باپ دادا کے وقت سے اب اخراجات بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ خانگی اخراجات چلانا بھی بہت مشکل ہو گئے ہیں۔ اس وقت اپنی عزت قائم رکھنے کے لئے پہلے سے چوگنا خرچ

ہوتا ہے۔ غرضیکہ جس طرح میرے والد بغیر سوچے سمجھے ہی دولت لٹا گئے ہیں۔ ویسا کرنے سے اب گزر نہ ہوگا۔ بلکہ اُس لٹی ہوئی دولت کو سمیٹنا ہی دانشمندی ہے۔

جوان کے دل نے کہا۔ انہوں نے وہی کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے سوچے ہوئے طریقہ پر عمل کرنے لگے۔

گھر سے جو کچھ باہر چلا گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ واپس آنے لگا۔ انہوں نے والد کی خیرات کا تھوڑا سا حصہ ضرور بحال رکھا۔ اور جو بھی رکھا۔ وہ اس طریقہ پر کہ وہ بہت مدت تک خیرات نہ سمجھی جائے۔ گوپی ناتھ کو ہر دوار میں ہی اپنے کاشتکاروں کی تکالیف معلوم ہو گئیں۔ یہاں تک کہ کئی کاشتکار تو وہاں پہنچ کر سب حال سنا آئے گوپی ناتھ نے چمن لال کو چٹھی لکھی۔ کہ ”یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

چمن لال نے جواب دیا کہ ”پہلے جس طرح کیا جاتا تھا۔ اُس طرح آمدنی کی بھی بہت صورتیں تھیں۔ اس وقت زمیندار کاشتکاروں کو دیتا تھا۔ اور وہ زمیندار کو دیتے تھے۔ اس وقت نئے قانون کے زیر اثر زمیندار کی بہت سی آمدنیں بند ہو گئی ہیں۔ صرف لگان ملتا ہے اور صرف لگان وصول کرنے کے اور کوئی بھی زمینداری کا رعب نہیں رہا۔ اس لئے میں اگر اپنی رہی سہی آمدنی پر بھی نگاہ نہ رکھوں تو آپ ہی

بتلائیے کہ کھاؤں کہاں سے؟ اس وقت نہ میں کاشتکاروں کو زیادہ دے سکتا ہوں۔ اور نہ اُن سے زیادہ ملنے کی توقع ہے۔ دان کرنے سے جلدی ہی بھکاری ہو جاؤں گا۔ عزت اور خاندان کو بچانا ناممکن ہوگا۔

گوپی ناتھ زمانہ کی اس تبدیلی کو دیکھ کر بہت فکر مند ہوئے انہوں نے سوچا کہ آج کل کے لڑکے آج کل کے ہی طریقہ پر کام کرتے ہیں۔ میرے وقت کے اصول اب کام نہیں دے سکتے۔ اگر میں دُور بیٹھا ان کے اُصولوں پر نکتہ چینی کروں گا۔ تو وہ کہیں گے کہ تم اپنی جائداد سنبھالو۔ ہم سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔ مجھے کیا؟ میں تو اپنی زندگی کے آخری دن ایشور بھجن میں گزاروں گا۔

— (۲) —

اسی طرح کام چلنے لگا۔ کئی مقدمے چلا کر چمن لال نے سب کام اپنی حسب خواہش کر لئے۔

بہت سے کاشتکاروں نے ڈر کر چمن لال کی سب جائز و ناجائز بشرط قبول کر لیں۔ صرف کریمن کالڑکار حیم کسی طرح بھی قابو نہ آیا۔ چمن لال کا غصہ بھی تیز ہو گیا۔ براہمن کو دان دینے کا تو کچھ مطلب بھی ہوا۔ مگر ایک مسلمان کو دان دینے سے کیا فائدہ؟

ایک معمولی مسلمان بیوہ کا لڑکا۔ گاؤں کے خیراتی سکول میں تھوڑا سا لکھنا، پڑھنا سیکھ کر اتنا غرور کرنے لگا کہ کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔

چمن لال کو پڑانے لو کروں سے معلوم ہوا۔ کہ رحیم کی ماں کریمین پر بھی بابو گوبی ناتھ بہت ہربان تھے۔ مگر اس ہربانی کا کوئی خاص سبب وہ نہ بتا سکے۔ شاید بیوہ اور یتیم بچے کو دیکھ کر ہی گوبی ناتھ کو ان پر رحم آگیا تھا۔

لیکن چمن لال کو گوبی ناتھ کی یہ ہربانی بہت ہی نا جائز معلوم ہوئی۔

چمن لال نے اُن کی بُری حالت نہ دیکھی تھی۔ اس وقت کی آسودہ حالت کو دیکھ کر۔ چمن لال یہی سمجھتے تھے کہ ان کے رچم ل والد گوبی ناتھ کو کریمین نے کسی طرح دھوکہ دے کر زمین کا کچھ حصہ بھگ لیا ہے۔

رحیم بھی عجیب خصالت کا جوان تھا۔ اس نے کہا۔ کہ جان چلی جائے مگر بابو گوبی ناتھ کی دھوکہ کی زمین میں سے ایک گز زمین بھی نہ دوں گا۔

دونوں طرف سے مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔

کریمین نے اپنے بیٹے رحیم کو بہت سمجھایا۔ کہ بیٹا زمیندار سے مقابلہ نہ کرو۔ اب تک جن کے رحم پر زندگی گذری ہے۔ ان کے ہی رحم پر رہ کر اپنی بقایا زندگی گزارو۔ تم زمیندار کی شرطیں مان لو۔

مگر رحیم نے جواب دیا: ”اماں تم ان معاملوں کو نہیں جانتی؟“
مقدمہ بازی میں رحیم کو شکست ہونے لگی۔ لیکن جتنی ہی وہ شکست
کھا رہا تھا۔ اتنا ہی وہ فتدی بن رہا تھا۔ اُس نے زمین
پر سب کچھ لگا دیا۔

ایک دن دوسرے پہر کے وقت کریمین رحیم سے پوشیدہ طور پر
کچھ ترکاریاں لے کر چمن لال کو ملنے گئی۔ اس نے جاتے ہی چمن لال
کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور بولی :-

”خدا تمہارا بھلا کرے بیٹا۔ رحیم کو خراب نہ کرو۔ میں اسے تمہیں
دیتی ہوں — اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر اس کی حالت کا خیال کر کے
اس کے کھانے پینے کا ذریعہ ”زمین اسے دید“ تمہارے پاس خدا کا دیا
بہت کچھ ہے۔ جتنی تمہاری زمین اس کے پاس ہے۔ اس سے تمہارا
کچھ بھی نقصان نہ ہوگا۔“

اپنی پست حالت کو دیکھ کر کریمین، چمن لال سے پھر رشتہ جوڑنے
آئی ہے۔ یہ دیکھ کر چمن لال تلملا اٹھا۔ اُس نے کہا۔
”تم عورت ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ اگر کچھ کہنا ہو۔ تو
اپنے لڑکے کو بھیجو۔“

کریمین نے اپنے اور غیر کے لڑکے سے یہی سنا کہ تم عورت ہو۔ اس

معالے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اللہ کا نام لے کر آنسو پونچھتے پونچھتے وہ گھر
لوٹ گئی

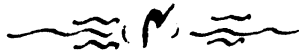
— (۱۱) —

مقدمہ دیوانی سے فوجداری۔ فوجداری سے ڈسٹرکٹ کورٹ
اور وہاں سے ہائی کورٹ پہنچا۔ اسی میں دو سال گزر گئے۔ رحیم جب سر
سے پاؤں تک قرض میں ڈوب گیا۔ تب کہیں جا کر اس کی جیت ہوئی۔
لیکن آسمان سے گرا۔ تو کھجور پر جا اٹکا۔ سرمایہ دار نے موقع پا کر
اپنی رقم وصول کرنے کے لئے مقدمہ کر دیا۔ آخر کار رحیم کا سب کچھ نیلام
ہونے کا دن مقرر ہو گیا۔

اُس دن جمعہ کا دن تھا۔ بازار بھی اسی روز لگا کرنا تھا۔ آج بھی
ندی کے کنارے بازار لگا۔ برسات سے ندی بھری ہوئی تھی۔ بہت سی
چیزیں بکری ہو رہی تھیں۔ اگست کا مہینہ تھا۔ آم خوب پک رہے تھے۔
بادل گھر سے ہونے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بر سے گا۔ رحیم بھی
بازار سے سامان لینے آیا۔ لیکن پاس ایک پسیہ بھی نہ تھا۔ آج کل
اسے کوئی اُدھار بھی نہ دیتا تھا۔ وہ ایک بڑا چھرا اور ایک ٹوٹا لیکر
بازار میں آیا تھا۔ وہ انہیں دو چیزوں کو فروخت کر کے سامان
خریدنا چاہتا تھا۔

شام کے وقت چمن لال بھی سیر کے لئے بازار آنکے۔ دوپا ہی لالھی لئے ساتھ تھے۔ بازار میں چمن لال ایک آدمی سے بات چیت کرنے لگے۔ کہ اتنے میں رحیم چھڑاتاں کر چمن لال پر جھپٹا۔ مگر لوگوں نے پکڑ کر پولیس کے حوالہ کر دیا۔ بازار میں پھر ویسے ہی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ اس واقعہ سے چمن لال کچھ خوش نہ ہوا۔ ہم جس کا شکرا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اگر ہم پر حملہ کرنے آئے تو اس کی ایسی بد ذاتی اور اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے۔ جو ہو۔ جیسا بد معاش وہ تھا۔ ویسی ہی منزرا سے ملے گی۔

اس واقعہ کو سن کر چمن لال، گھر کی عورتوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے سب نے کہا۔ رحیم بڑا پا جی ہے۔ اسے کافی منرا ملنی چاہئے۔ اسی خیال سے مرب کو سکون حاصل تھا۔



اسی طرح چار دن گزر گئے۔ کل ڈپٹی کلکٹر کے اجلاس میں رحیم کا مقدمہ سنا جائے گا۔ چمن لال کو حلفیہ بیان دینے جانا ہو گا۔ اب تک چمن لال گواہی کے کٹھڑے میں نہ گئے تھے۔ لیکن اس معاملہ میں گواہی دینے میں انہیں کوئی غائبہ تھی۔ دوسرے دن عین وقت پر چشمہ لال گھوڑی پر سوار ہو کر کچہری پہنچے۔ ڈپٹی صاحب نے عزت سے اپنے پاس کرسی دی۔

اجلاسِ تہل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ آج تک پجھری میں اتنی بھیڑ نہ ہونی تھی۔
مقدمہ پیش ہونے میں کچھ بھی دیر نہ تھی۔ اسی وقت چمن لال کے
ایک آدمی نے اُن کے کان میں کچھ کہا۔ وہ اُسی وقت ”ایک ضروری کام
ہے“ کہہ کر عدالت سے باہر چلے گئے۔

باہر آ کر دیکھا۔ کہ تھوڑی دُور پر بڑے درخت کے نیچے ان کے والد
کھڑے ہیں۔ ننگے پاؤں رام نامی دوپٹہ اوڑھے۔ ہاتھ میں مالائے
جپ رہے ہیں۔ اُن کے چہرہ سے نور نکلتا تھا۔

اپکن وغیرہ پہنے۔ چمن لال نے بڑی مشکل سے اپنے والد کو نسکار
کی۔ اور پاس ہی ایک وکیل کے تحت پر چل بیٹھنے کے لئے کہا۔ مگر گوپی
نے جواب دیا۔

”وہ نہیں۔ میں نے جو کچھ کہنا ہے۔ یہیں کھڑے کھڑے کہوں گا۔“

چمن لال پھر خاموش رہے۔

گوپی ناتھ پھر لوے ”رحیم کو چھڑانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اور

اس کی جائداد جو تم نے لے لی ہے۔ اُسے بھی واپس کرنا ہوگا۔“

چمن لال نے حیرانی سے دریافت کیا۔ ”تو آپ اسی لئے اتنی دُور

سے آئے ہیں؟ رحیم پر آپ کی اتنی عنایت کیوں ہے؟“

”یہ سُن کر کیا کرو گے“۔ گوپی ناتھ نے بخندگی سے جواب دیا

چمن لال نہ مانا۔ اور بولا۔۔۔ ”نا تجربہ کاری کا خیال کر کے کتنے ہی لوگوں کی زمینیں میں نے واپس لے لی ہیں۔ ان میں بہت سے براہمن بھی تھے۔ مگر آپ نے ان کے متعلق تو کوئی دست اندازی نہیں کی۔ اور اس مسلمان چھوکرے کے لئے آپ نے اتنی تکلیف اٹھائی مقدمہ چلا کر اگر میں رحیم کو چھوڑ دوں۔ یا زمین واپس کر دوں۔ تو لوگ کیا کہیں گے؟“

گوپی ناتھ کچھ دیر تک خاموش رہے اور اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے مالا پھیرتے ہوئے بولے۔ ”اگر لوگوں کے روبرو سب خلاصہ کہنا ضروری ہو۔ تو ان کو کہنا۔۔۔ رحیم تمہارا بھائی ہے۔ میرا بیٹا ہے۔“

چمن لال نے چونک کر کہا۔ ”مسلمانی کے پیٹ سے؟“

”ہاں۔“

چمن کافی دیر خاموش کچھ سوچتا رہا۔ اس کے دماغ میں خیال پیدا ہوا۔ کیا شعلہ نفس کے زیر اثر انسان اندھا ہو جاتا ہے؟ پھر اس نے باپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”وہ آپ پہلے گھر چل کر آرام کریں۔ یہ سب بعد میں ہو جائے گا۔“

گوپی ناتھ نے کہا۔ ”دو نہیں۔ میں اب گھر نہیں جاؤنگا۔ بلکہ

ابھی یہاں سے ہی لوٹتا ہوں۔ تم جو مناسب سمجھو کرو۔“

یہ کہہ کر وہ چل پڑے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور
جیم کانپ رہا تھا۔

چمن لال کسی فتح پر نہ پہنچے۔ والد سے کیا کہنا چاہئے۔ مگر یہ بات
اُن کے ذہن میں لگئی۔ کہ پہلے زمانہ کا دھرم ایسا ہی تھا۔ علم اور
چال چلن میں اُنہوں نے اپنے آپ کو والد سے بہت اوپر
پایا۔ اُن کو یقین ہو گیا۔ کہ ایک اصول نہ ہونے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔
عدالت میں جب وہ آئے تو دیکھا کہ جیم دو سپاہیوں کے درمیان
بہتھکڑی پہننے بیٹھا ہے۔ اس کا جیم کمزور ہو رہا ہے۔ ہونٹ خشک ہو
گئے ہیں۔ مگر آنکھوں سے شرافت اور اعلیٰ خانہ دانی ٹپک رہی ہے۔
ایک گندی قمیض پہنے ہوئے ہے۔ اور چمن لال کا بھائی ہے۔“

چونکہ چمن لال کی ڈپٹی کلکٹر سے دوستی تھی۔ اس لئے بات بنا کر مقدمہ
خارج کرادیا۔ کچھ دنوں بعد جیم کی حالت پھر پہلی سی ہو گئی۔ مگر اس کا
سبب اسے بھی معلوم نہ تھا کہ یہ چھپکارا کیسے ہوا۔ اور چمن لال نے سب
زمین وغیرہ کیوں واپس کر دی۔ دوسرے دن لوگوں کو بھی اس
بات سے حیرانی ہوئی۔

مقدمہ کے دن گوپنی ناتھ کے آنے کی خبر آنا خانہ سارے گاؤں
میں پھیل گئی۔ لوگ اس بات کو لے کر کاناپھوسی کرنے لگے۔

رام لال وکیل کو گوپی ناتھ نے اپنے خرچ سے پڑھا لکھا کر اس مہجہ تک پہنچایا تھا۔ کہ وہ آج وکیل کہلانے لگا۔ اس کو اس بات کا شک تھا۔ لیکن آج۔۔۔۔۔ اُس نے بخوبی سمجھ لیا کہ اچھی طرح بال کی کھال اُتارنے سے سب ہمانتاؤں کے پوشیدہ راز کھولے جاسکتے ہیں۔ کوئی چاہے جتنی مال بچے۔ دُنیا میں سب میرے ایسے ہی ہیں۔ دُنیا میں سا دھوؤں اور عام انسانوں میں یہی فرق ہے۔ کہ سا دھو لوگ چالاک ہوتے ہیں۔ اور عام لوگ عام خیالات کے ہوتے ہیں۔ سا دھو لوگ چھپا کر پاپ کرتے ہیں۔ اور عام لوگ کھلے طور پر۔ غرضیکہ رام لال نے گوپی ناتھ کی ہربانیوں اور خیراتوں کے اصول کو ایک ڈھونگ ٹھہرا کر اس راز کا حل کر لیا۔

تم ہزار شرم ہی ہم نے لاکھ ضبط
وہ رازِ عشق ہے کہ چھپایا نہ جاسکا

شعله انتقام

افسانه نمبر ۵

تمہارا جال

اے میرے مالک! نا معلوم تم کس طرح گاتے ہو۔ میں تو حیرت سے
خاموش ہمیشہ خاص توجہ سے سنا کرتا ہوں۔

تمہارے نغمہ کا نور تمام عالم کو منور کرتا ہے۔ تمہارے گانے کی لہر
زمین و آسمان میں ایک گونج پیدا کر رہی ہے۔ تمہارے گانے کی آہستہ
پتھر ٹلی رکاوٹوں کو کاٹتی ہوئی تیزی سے بہہ رہی ہے۔

میرا دل تمہارے گانے میں شامل ہونے کو بہت چاہتا ہے۔ لیکن
کوشش کرنے پر بھی آواز پیدا نہیں ہوتی۔ میں بولنا چاہتا ہوں۔ مگر
آواز نغمہ کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتی۔ بس میں اپنی شکست تسلیم کرتا
ہوں۔

اے میرے مالک! تم نے میرے دل کو اپنے گانے کے جال
میں پھانس لیا ہے۔

شعلہ انتقام

شکست کھائے ہوئے شاہ شجاع۔ جب اورنگ زیب کے خوف سے بھاگ کر اراکان کے راجہ کے پاس پناہ گزین ہوئے۔ تو ان کے ساتھ ان کی تینوں خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں۔ اراکان کے راجہ کی خواہش ہوئی کہ اس کے تینوں شہزادوں کی شادیاں۔ ان تینوں لڑکیوں سے ہو جائیں۔ انہوں نے اپنی خواہش شاہ شجاع پر ظاہر کی۔ جسے سن کر وہ بہت ناراض ہوئے۔

ایک دن راجہ نے زبردستی شاہ اور اس کی بیٹیوں کو کشتی میں بٹھا کر ندی میں ڈبونے کی سازش کی۔ اس مصیبت کے وقت شاہ نے

سب سے چھوٹی لڑکی امینہ کو اپنے ہاتھوں بہتی ندی میں پھینک دیا۔ بڑی لڑکی نے خودکشی کر لی۔ منجھلی لڑکی زلیخا کو شاہ کا ایک وفا دار ملازم جس کا نام رحمت تھا۔ تیر کر لے بھاگا۔ اور شاہ خود لڑ کر وہیں جان بحق ہوئے۔ امینہ پانی کے بہاؤ کی طرف بہتی بہتی ایک ماہی گیر کے جال میں جا پھنسی۔ وہ اسی ماہی گیر کے ہاں پرورش پا کر جوان ہوئی۔ ایک دن صبح ہی ماہی گیر نے امینہ سے کہا ”آج تجھے کیا ہو گیا ہے۔ تم نے کچھ کام ہی نہیں کیا۔ میرا نیا جال کہاں ہے؟ میری وہ لگی اٹھا کر ناؤ پر نہیں رکھی۔“

امینہ نے ماہی گیر کے پاس آ کر مودہ بانہ کہا۔ ”میری بہن آنی ہوئی ہے۔ اس لئے آج کام سے بھٹی کی ہے۔“

ماہی گیر نے جیڑنی سے پوچھا۔ ”تیری کون بہن؟“
 زلیخا نے معلوم کہاں سے نکل آنی۔ اور بولی ”میں ہوں۔“
 ماہی گیر سناتے میں آ گیا۔ اس کے بعد زلیخا کے بہت قریب جا کر اُسے اچھی طرح دیکھا۔

پھر سب سے پہلے یہی سوال کیا۔ ”تم کچھ کام کاج بھی جانتی ہے؟“

امینہ نے کہا۔ ”بہن کی طرف سے ہیں کام کدوں گی۔ وہ کچھ کام

”نہ کریں گی۔“

ماہی گیر کچھ سوچ کر زلیخا سے بولا۔ ”ہاں تو تم رہو گی کہاں؟“
 ”امینہ کے پاس۔“

ماہی گیر نے سوچا۔ یہ بُری آفت ہوئی۔ اس نے پھر سوال کیا۔
 ”دکھائے گی کیا؟“

”اس کا کوئی فکر نہیں۔“ کہہ کر زلیخا نے لا پرواہی سے ایک اشرفی
 ماہی گیر کی طرف پھینکی۔ امینہ نے وہ اشرفی اٹھا۔ ماہی گیر کو دی۔ اور
 آہستہ سے کہا۔ ”ماہی گیر اور کچھ مت کہنا۔ کام پر جاؤ۔ دیر
 ہو رہی ہے۔“

زلیخا۔ خفیہ طور پر گھومتی پھرتی آخر میں امینہ کے پاس ماہی گیر کے
 جھونپڑے میں آگئی۔ اس کے گزشتہ حالات لکھنے سے ایک دوسری
 کہانی ہو جائے گی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کے محافظ نے نام بدل کر
 ارکان کی ریاست میں نوکری کر لی تھی۔

گرمی کے دن تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ ندی کے کنارے کیلو کے
 پھول کی پنکھڑیاں گر گر کر ندی کو لال کر رہی تھیں۔

اسی درخت کے نیچے زلیخا نے امینہ سے کہا ”ابا جان کی موت
 کا بدلہ چکانے ہی کے لئے خدا نے ہم دونوں بہنوں کو زندہ رکھا ہے۔“

اس کے علاوہ تو مجھے کوئی اور سبب نظر نہیں آتا۔ میرے دل میں انتقام کی جوا لٹھ رہی ہے۔“

امینہ نے مدی کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھتے دیکھتے بہن یہ باتیں نہ ہی کر دو تو اچھا ہے۔ مجھے اس دُنیا سے ایک طرح کی محبت ہو گئی ہے۔ مرد چاہے خون خرابا کر کے مرے مگر مجھے اس جگہ کوئی تکلیف نہیں۔“

”چھی۔ چھی۔ امینہ تو شہزادی ہے۔ ذرا سوچ تو سہی۔ کہاں دہلی کا تخت اور کہاں اس ماہی گیر کی جھونپڑی؟“

امینہ نے ہنس کر کہا: ”بہن! اس ماہی گیر کی جھونپڑی اور کھیلو کے درخت کی چھایا۔ اگر کسی لڑکی کو دہلی کے تخت سے اچھی معلوم ہو۔ تو دہلی کا تخت ایک آنسو بھی نہ گرائے گا۔“

زینبی کچھ کھسیانی سی ہو کر بولی: ”تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم اس وقت بالکل نکلی سی تھیں۔ لیکن ذرا سوچ تو سہی۔ ابا جان مجھے ہی سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اسی لئے مجھے اپنے ہاتھوں سے مدی میں ڈال دیا تھا۔ اس زندگی کو اس باپ کی دی ہوئی موت سے زیادہ مت سمجھ۔ اگر تو باپ کا بدلہ لے سکے۔ تو تمہارا جینا بے کار ہے۔ تمہیں مرجانا ہی بہتر ہے۔“

امینہ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ زلیخا نے بھانپ لیا کہ اس نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کا دل کسی خاص خوش کن خواب کا مزہ لے رہا ہے۔ وہ اپنی نئی جوانی میں مست نامعلوم کیا سوچ رہی ہے۔ امینہ نے کچھ دیر بعد کہا: ”بہن میں ذرا گھر کا کام کر آؤں؟ اگر میں نہ پکاؤنگی۔ تو ماہی گیر بھوکا ہی رہ جائے گا۔“

امینہ کی یہ حالت دیکھ کر زلیخا بہت اُداس ہوئی۔ وہ بیٹھی بیٹھی اس کی حالت پر غور کرنے لگی۔ اسی وقت اچانک ہی درخت سے کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

زلیخا نے ڈرتے ہوئے پوچھا: ”کون ہے؟“
آواز سن کر زلیخا کی آنکھوں پر سے ہاتھ اُٹھا کر نوجوان اس کے سامنے آگیا۔ نوجوان نے بغیر کسی خوف سے زلیخا سے پوچھا: ”تم تو امینہ نہیں ہو۔ غلطی ہوئی۔ معاف کیجئے گا۔“

زلیخا۔ اپنے کپڑے سنبھال کر غرور کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے کڑی نگاہ سے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا: ”تم کون ہو؟“
”تم مجھے نہیں جانتی۔ امینہ جانتی ہے۔ امینہ کہاں ہے؟“

اس شور و غل کو سن کر امینہ وہاں آگئی۔ زلیخا کا غصہ اور اُس

نوجوان کو ہنستے دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

امینہ نے زلیخا سے کہا ”بہن اس کی باتوں کا عفتہ نہ کرنا۔ یہ آدمی تھوڑا ہے۔ یہ تو ایک جنگلی ہرن ہے۔ اگر اس نے کچھ بے ادبی کی ہو۔ تو میں اسے منراؤنگی۔۔۔ دالیا! تم نے کیا کیا ہے؟“

دالیا دیکھ کر اس نوجوان کا نام ہے، جھٹ بول اٹھا۔ میں نے آنکھیں بند کی تھیں۔ میں سمجھا کہ تم بیٹھی ہو۔ لیکن وہ تم تو نہیں ہو۔“

امینہ نے عفتہ ظاہر کرتے ہوئے کہا ”کیوں کہتے ہو۔ تم نے امینہ کی آنکھیں بند کی تھیں۔ تمہاری اتنی ہمت؟“

نوجوان نے کہا ”آنکھیں بند کرنے میں تو ہمت کی ضرورت نہیں۔ جبکہ پہلے ہی سے اس کی عادت ہو لیکن امینہ میں ان کو دیکھ کر ڈر تو بہت گیا تھا۔“

”نہیں! تم بہت ہی گنوار ہو۔۔۔ امینہ نے کہا۔۔۔ تمہیں

شہزادی کے سامنے کھڑا ہونا بھی نہیں آتا۔ تجھے میں مودبانہ پیش آنے کی تعلیم دوں گی۔ دیکھ اس طرح سلام کرو۔“

امینہ نے اپنی نازک کمر کو جھکا کر بتلایا اور دالیا نے بڑی مشکل سے اس کی نقل کی۔ اس کے بعد امینہ نے اس کو چار قدم پیچھے ہٹ کر سلام کرنے کو کہا۔

دالیا نے حکم سنتے ہی پھر سلام کیا۔ اسی طرح امینہ اس کو پیچھے ہٹاتی ہٹاتی جھونپڑی کے دروازہ تک لے گئی۔
 دوسری جھونپڑی کا دروازہ دکھلا کر امینہ نے دالیا سے کہا۔
 ”اس کے اندر چلو۔“ دالیا اس کے اندر چلا گیا۔ امینہ نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ”ڈراگھر کا کام کرو۔ آگ جلا دو۔“ کہہ کر اپنی بہن کے پاس جا پہنچی۔

امینہ نے زلیخا سے کہا: ”بہن غصہ نہ کرنا۔ یہاں کے آدمی اسی طرح کے ہیں۔ میں تو اس کی جہالتوں سے تنگ آ گئی ہوں۔“
 لیکن امینہ کے چہرے پر ان باتوں سے صداقت ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی باتوں سے تو وہاں کے لوگوں سے ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔
 زلیخا نے خفگی سے کہا: ”امینہ تیرا حال دیکھ کر مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ ایک اجنبی نوجوان کی یہ جرأت کہ وہ تیرے بدن کو ہاتھ لگائے۔“
 امینہ اپنی بہن کی بات کاٹ کر بولی۔ ”ہاں بہن! اگر کسی بادشاہ یا نواب کا لڑکا۔ ایسی حرکت کرتا تو وہ ضرور بے عزتی سے ٹھکرایا جاتا۔“
 زلیخا سے ہنسی روکی نہ گئی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ ”سچ کہو امینہ! کیا اسی گنوار کے لئے ہی تجھے اس زمین سے محبت ہو گئی ہے۔“
 ”سچ ہے۔ بہن۔ یہ آدمی میرے بڑے کام آتا ہے۔ آگ جلا دیتا

ہے۔ گھر کا کام کر دیتا ہے۔ غرضیکہ کسی کام کے لئے پکارو۔ بھاگا آتا ہے۔

میں اکثر ارادہ کرتی ہوں۔ کہ اس کی جاہلانہ حرکتوں کی سزا دوں۔

مگر اس ارادہ کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی۔ اگر کبھی ہاتھیں دکھاتی

ہوں تو کھلکھلا کر سنسن دیتا ہے۔ اس ملک میں شاید ایسے ہی ہنسی

کی جاتی ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے۔ کہ اگر دو گھونے بھی مار

دیئے جائیں۔ تو یہ بہت خوش ہو جاتا ہے۔ دیکھو نہ اس جھوٹے

میں بند کر رکھا ہے۔ اس سے وہ بہت ہی خوش ہوگا۔ دروازہ کھول

کر دیکھ لو۔ وہ خوشی کے ساتھ آگ سٹکار رہا ہوگا۔ میں کیا کروں بہن؟

اس پر نامعلوم میرا زور کیوں نہیں چلتا؟

زلجیانے کہا۔ ”اچھا میں کوشش کر کے دیکھوں گی؟“

امینہ نے ہنس کر بڑی عاجزی سے کہا ”بہن! میں تیرے پاؤں

پڑتی ہوں۔ اُسے کچھ نہ کہنا“

امینہ نے یہ بات ایسے کہی۔ جیسے واقعی وہ نوجوان اس کا پالتو

ہرن ہے۔ ابھی تک اس کا جنگلی پن دور نہیں ہوا۔

اُسی وقت ماہی گیر نے آکر پوچھا ”آج والیا نہیں آیا؟“

”آیا ہے۔“

”کہاں گیا؟“

”وہ بڑا اُدھم مچا رہا تھا۔ اس لئے اسے کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے“

ماہی گیر نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”اگر وہ تمہیں تنگ کرتا ہو تو خفا مت ہونا۔ اس عمر میں انسان ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ اسے ڈانٹنا مت۔۔۔ دایا نے کل ایک اشرفی دے کر مجھ سے تین مچھلیاں لی تھیں“ امینہ نے کہا۔ ”فکر مت کرو۔ میں آج اُسے ایک مچھلی دے کر دو اشرفی وصول کر لوں گی۔“

اپنی پالی ہوئی لڑکی کو اتنی عمر میں چالاک اور ہوشیار دیکھ کر ماہی گیر بہت خوش ہوا۔ اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا چلا گیا۔

حیرانی کی بات ہے کہ کچھ دن بعد دایا کے آنے جانے سے زلیخا کے حالات بدل گئے۔ اگر کچھ سوچ کر دیکھا جائے۔ تو اس میں حیرانی کی بات بھی نہیں ہے۔ ندی میں جیسے ایک طرف بہاؤ ہوتا ہے اور دوسری طرف کنارہ۔ اسی طرح عورت کے دل میں جوش اور دوسری طرف دنیا داری ہوتی ہے۔ لیکن دنیا کے ایک طرف بسنے والے اراکان میں دنیا دار کہاں؟

وہاں صرف ہر موسم میں درخت پھوٹتے ہیں۔ سامنے کی ندی

بسات میں بڑھ کر سردیوں میں صاف رہ کر اور گرمیوں میں ٹھنڈی ہو کر اپنی بہار دکھلاتی ہے۔

یہاں رہتے زلیخا کو دو برس ہو گئے۔ مگر کبھی کبھی پھر بھی سوچتی۔ کہ شہزادی کی زندگی کیا یونہی گذرنی چاہئے؟
ایک دن صبح دایا کے آتے ہی زلیخا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”دایا کیا تم یہاں کے راجہ کو دکھلا سکتے ہو؟“
”جی ہاں۔ کیا کام ہے؟“

”میرے پاس ایک چھڑا ہے۔ میں وہ اس کی چھاتی میں گھوپ دینا چاہتی ہوں۔“

یہ سن کر پہلے تو دایا حیران ہوا۔ اس کے بعد زلیخا کے خدخال دیکھ کر وہ بنسنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُس نے ایسا مذاق پہلے کبھی نہیں سنا۔ اگر دل لگی بھی ہو۔ تو شہزادی کے ہی لایق ہے۔
یہ سوچ کر وہ پھر بنسنے لگا۔

دوسرے دن زلیخا کے پاس رحمت علی کا ایک خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ اراکان کے راجہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ دونوں شہزادیاں ماہی گیر کے ہاں رہتی ہیں۔ وہ چھپ کر امینہ کو دیکھ آئے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ اب بہت جلد ہی اُس سے شادی کی

تیاریاں کر رہے ہیں۔ انتقام لینے کا موقعہ اس سے اچھا نہیں ہو سکتا۔
 زلیخا نے مضبوطی سے امینہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”خدا کی مرضی صاف
 معلوم پڑتی ہے۔ امینہ۔ اب اس سے اچھا موقعہ پھر نہ ملے گا۔ اس لئے
 اپنی زندگی کا فرض ادا کرنا چاہئے۔ اب یہ کھیں گوڈ میں پھنسے رہتا
 اچھا نہیں۔“

دالیا وہیں کھڑا تھا۔ امینہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ مہنس
 رہا تھا۔

امینہ نے اُسے ہنستے ہوئے دیکھ کر کہا: ”جانتے ہو دالیا ابیں
 رانی بننے جا رہی ہوں۔“

دالیانے کہا: ”مگر بہت دیر کے لئے نہیں۔“

امینہ نے سوچا۔ واقعی یہ جنگلی ہرن ہی ہے۔ اس کے ساتھ
 انصاف کرنا میرا پاگل پن ہے۔ امینہ نے دالیا کی طرف دیکھتے ہوئے
 کہا: ”کیا میں راجہ کو مار کر پھر زندہ واپس آسکوں گی؟“
 دالیانے اپنی بات کو ٹھیک سمجھتے ہوئے کہا: ”ہاں! واپس
 آ جانا ہی بہتر ہے۔“

زلیخا کی طرف پھر کر اس نے کہا: ”بہن میں تیار ہوں۔“
 پھر دالیا کی طرف دیکھ کر بولی: ”رانی ہونے ہوئے ہی میں

راجہ کے خلاف کارروائی میں شامل ہونے کے قصور میں تمہیں
سزا دے دی گئی ؟

دالیا نے سمجھا۔ شاید یہ بھی مذاق ہے۔ وہ اپنی عادت کے
مطابق ہنسنے لگا۔

سوار۔ پیدل۔ جھنڈے۔ ہاتھی۔ باجے اور روشنی کے سامان
سے ماہی گیر کا گھر بھر گیا۔ راجہ کے محل میں دونوں شہزادیوں کو لے
جانے کے لئے دوپالکیاں بھی آئیں۔

امینہ نے زلیخا کے ہاتھ سے چھری لی۔ اُس کی مٹھ پر ہاتھی دانت
کی کاریگری کو بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر یکایک اپنی انگلیاں
چھپالی۔

امینہ کی بڑی خواہش تھی کہ جانے سے پہلے ایک دفعہ دالیا
سے ملتی۔ لیکن وہ کل سے لاپتہ تھا۔ تو کیا دالیا کی اُس مہنسی میں
رُوٹھنا چھپا تھا ؟

امینہ نے پالکی میں چڑھنے سے پہلے اپنے محافظ کے جھوپڑے
پر نظر ڈالی۔ اپنے جھوپڑے کے ارد گرد کے درختوں اور ندی کو
دیکھا۔ ماہی گیر کی طرف دیکھ کر خوشی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
لیا۔ اور کہا ”بابا۔ میں جاتی ہوں۔“

امینہ تو جانتی ہے، اب تیرے گھر کا کام کون کرے گا؟
 ماہی گیر بچے کی طرح رو اٹھا۔
 ”ماہی گیر۔ اگر دایا یہاں آئے۔ تو اُسے یہ انگوٹھی دے دینا۔
 کہنا۔ امینہ جاتے وقت دے کٹی بھئی“

انگوٹھی دے کر امینہ جلدی سے پالکی پر سوار ہو گئی۔ بڑی
 شان و شوکت سے دونوں پالکیاں محل کی طرف چلیں۔ امینہ کے
 رہنے کا جھونپڑا۔ ندی کنارہ اور پھول آئسو بہا رہے تھے۔ آخر دونوں پالکیوں
 محل کی ڈیور بھی پر جا کر گئیں۔ دونوں بینیں پالکیوں سے اتر پڑیں۔ امینہ کے
 منہ پر ہنسی یا آنکھوں میں آئسو نہ تھے۔ زلیخا کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

فرض جب تک دور تھا۔ تب تک زلیخا کو حوصلہ تھا۔ مگر اس وقت
 اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ محبت سے بیتاب زلیخا نے بہن کو چھاتی سے
 لگایا۔ اپنے دل میں کہنے لگی۔ نئی محبت کے کچے سے توڑ کر کیں اس کھلے
 پھول کو کس خون کی ندی میں بہانے لگی ہوں؟

لیکن اب سوچنے کا وقت نہ تھا۔ ہزاروں لونڈیاں ہاتھوں میں
 روشنی لئے راستہ دکھاتی آگے جا رہی تھیں۔ اور ان کے پیچھے دونوں
 بہنیں۔ پس پردہ

راجہ کے محل کے دروازہ پر پہنچ کر امینہ نے زلیخا سے کہا ”بہن“

زلیخا نے اس کا منہ چوم لیا۔
 دونوں نے محل کے اندر قدم رکھا۔
 کمرے کے اندر ایک عالیشان پلنگ پر بادشاہی پوشاک پہنے
 راجہ بیٹھے تھے۔ امینہ شرم سے وردازہ کے پاس کھڑی ہو گئی۔
 زلیخا نے آگے بڑھ کر راجہ کے پاس پہنچ کر دیکھ ہنس رہے
 تھے۔

زلیخا کہہ اٹھی۔۔۔ ”دایا“۔
 امینہ بے ہوش ہو گئی۔ زخمی پرند کی طرح گر پڑی۔ امینہ کو گود میں
 اٹھا کر دایا پلنگ پر لے گیا۔ ہوش آنے پر امینہ نے انگلیاں سے چھری
 نکال کر بہن کی طرف دیکھا۔ بہن نے دایا کی طرف دیکھا۔ دایا
 ہنستے ہنستے دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اور چھری بھی میان سے نکل
 کر یہ تماشا دیکھ کر ہنسنے لگی۔ شعلہ انتقام دایا کی ہنسی میں سرد ہو
 چکا تھا۔

میں اپنی زندگی سے غافل رہا ہوں، مگر اب اس کا
 منہ

شعله غم

افسانه نمبر ۶

۱۱

روانگی

مجھے اجازت مل گئی ہے۔ اسے بھاٹیو! مجھے جانے دو۔ میں تم سب کو پرنام کرتا ہوں۔

یہ لومیرے دروازے کی چابیاں۔ میں اپنے گھر کی تمام ملکیت کو خیر باد کہتا ہوں۔ اور تم سے صرف آخری میٹھے الفاظ کی خواہش کرتا ہوں۔

ہم کافی دیر تک پڑوسی بن کر رہے۔ لیکن میں نے جتنا لیا اتنا دے نہ سکا۔ بس سُورج نکلا ہے۔ اور وہ چراغ گل ہو گیا۔ جس سے میرے اندھیرے کو نے میں روشنی ہوتی تھی۔ مجھے طلب کیا گیا ہے۔ اور میں سفر کے لئے تیار ہوں۔

شعلہ غم

مدن ایک کلرک تھا۔ اُسے دُنیا کے عیش و آرام سے دُور کا بھی
 رشتہ نہ تھا۔ اسے کبھی خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ دُنیا میں عیش و عشرت
 بھی کوئی ضروری یا غیر ضروری چیز ہے۔ اس کی عمر کا صرف ایک مقصد
 تھا۔ بس جس طرح ایک بیل آنکھیں موندھے اپنے کام میں لگا
 رہتا ہے۔ ویسے ہی مدن بھی اپنے کام میں ہی لگا رہتا تھا۔
 صبح اُٹھتا۔ حقہ ہاتھ میں لیتا۔ اور ننگے بدن گلی کے چوترے پر
 جا بیٹھتا۔ طرح طرح کے آدمی آتے جاتے۔ گھوڑا گاڑیاں چلتیں بھکاری
 گاکر بھیک مانگتے۔ انہی سب ہاتوں سے وہ اپنا دل بہلا یا کرتا۔

۹ بجے کے قریب اُٹھتا۔ بدن پر تیل کی مالش کرتا۔ غسل کرتا اور کھانا کھا کر دفتر چلا جاتا۔ دفتر سے واپسی پر اپنے ہمسایہ بہاری کی ٹھیک میں شام تک بیٹھا اخبار پڑھتا رہتا۔ کھانے کے وقت گھر آتا۔ کھانا کھاتا اور سو رہتا۔ یہی اس کا معمول تھا۔

اُسی دوران میں مدن کی بیوی روپا سخت بیمار ہو گئی۔ بنجار کسی طرح بھیجا ہی نہ چھوڑتا تھا۔ ڈاکٹر جتنی کوشش بنجار اُتارنے کی کرتا۔ بنجار اتنے ہی زور سے ہوتا۔ اسی حالت میں روپا چالیس دن تک بستر پر پڑی رہی۔

مدن کا دفتر چنانہ بند تھا۔ بہاری کے ٹھیک خانہ میں بھی کئی دنوں سے نہ گیا تھا۔ وہ بہت ہی بدحواس ہو گیا۔ دن میں کئی کئی دفعہ روپا کے پاس جاتا۔ بیمار پُرسی کرتا۔ اور باہر آ کر حقہ کے کش لگانے میں مصروف رہتا۔ ڈاکٹر روزانہ آتا۔ دوائی بدلتا۔ غرضیکہ روپا کی صحت کے لئے وہی ہوتا۔ جو ڈاکٹر کہتا

خُدا خُدا کر کے روپا صحت یاب ہوئی۔ مگر جسم بڑیوں کا ڈھانچہ بن گیا۔ ایک قدم بھی بغیر کسی مدد کے نہ چل سکتی تھی۔

بہشت کا موسم آ گیا۔ موسم میں تبدیلی واقع ہوئی۔ سرد ہوا نے قدرے گرمی پکڑی۔

رُوبا کے کمرہ کے نیچے ہی پڑوسی گھر کا ایک چھوٹا سا باغچہ تھا۔ مگر اُجڑا ہوا کسی وقت کسی نے شوق سے کئی قسم کے پھولوں کے پودے لگائے تھے۔ مگر بعد میں اُن کی طرف خیال نہ کیا۔ ایک طرف کئی قسم کی بلیں بھلی ہوئی تھیں۔ بڑے بھاری بڑکے درخت کے نیچے گھاس پھوس کا جنگل سا بنا ہوا تھا۔ باورچی خانہ کے پاس کی دیوار خستہ حالت میں تھی۔ اوداس کی گری ہوئی اینٹیں پاس ہی بکھری پڑی تھیں۔

ان دنوں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس لیٹ کر رُوبا اُسی باغچہ کو دیکھ کر دل بہلاتی تھی۔ اُس وقت جب مَن اس کے پاس بیٹھ کر پوچھتا، کیوں طبیعت کیسی ہے؟ تب اس کی آنکھیں پر نم ہو جاتی تھیں۔ بیماری کے سبب بچکے ہوئے چہرہ میں اس کی آنکھیں بہت بڑی معلوم پڑتی تھیں۔ اُنہیں بڑی بڑی پُر محبت آنکھوں سے دُن کی طرف دیکھتی ہوئی۔ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ لیٹی رہتی تھی۔

اسی طرح وقت گزرنا گیا۔ ایک دن ٹوٹی دیوار کی ایک دراڑ سے نکلے ہوئے چھوٹے سے پیل کے پودے کی شاخوں سے جھانکنا ہوا چاند آسمان کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ شب کی خوبصورتی میں کچھ کچھ

ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اُسی وقت دن کے سر کے بالوں کو انگلیوں سے اُٹھتی ہوئی روپا بولی: ”میرے تو اولاد ہی نہیں۔ تم دوسرا بیاہ کر لو“

روپا کئی دنوں سے یہی بات سوچ رہی تھی۔ دل جب خوشی میں ہوتا ہے۔ یا کسی کی سچی الفت کی یاد میں تڑپتا ہے۔ تب انسان سوچتا ہے کہ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ تو اچانک ہی کسی قسم کی قربانی دکھانے کا خیال شعلہ زن ہوا اُٹھتا ہے۔ دریا کی لہریں جیسے ہی کناروں سے ٹکراتی ہیں۔ ویسے ہی محبت کا جوش۔ انتہا کی خوشی اپنے آپ کو مصیبت پر پکھا کر کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔

ایسی ہی حالت میں ایک دن محبت بھرے دل سے روپا نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اپنے خاوند کے لئے کوئی بڑی بھاری قربانی کرے گی۔ لیکن جتنی خواہش ہوتی ہے۔ اتنی طاقت کس میں ہوتی ہے۔ ہاتھ میں کیا ہے۔ کیا دیا جائے۔ دولت نہیں ہے۔ عقل نہیں ہے۔ صرف ہے تو زندگی ہے۔ اُسے، اگر خاوند پر قربان کرنا پڑے۔ تو بھی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اس زندگی کی بھی کیا قیمت ہے؟

پھر روپا سوچتی سمجھتی ”اگر میں اپنے خاوند کو خوبصورت بچہ

دے سکتی۔ لیکن یہ تو میں جان دینے پر بھی نہیں کر سکتی۔ تب روپا کو یہ خیال آیا کہ وہ اپنے خاوند کی دوسری شادی تو کر سکتی ہے۔ اس خیال سے وہ بہت ہی خوش ہوئی۔

مدن نے جب بیوی کے منہ سے اپنی دوسری شادی کا ذکر سنا۔ تو اس نے اس بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔ دوسری تیسری دفعہ ذکر آنے پر بھی جب اس نے ادھر توجہ نہیں کی۔ تب خاوند کا اس معاملہ میں انکار اور بے رخی دیکھ کر روپا کو جتنی خوشی اور راحت نصیب ہوئی۔ اس سے دو چند مدن کا دوسری شادی کرانے کا ارادہ بڑھتا گیا

ادھر اپنی بیوی سے کئی دفعہ یہ ذکر سن کر۔ مدن کو یقین ہو گیا کہ دوسری شادی کا ہونا کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ اسی لئے آہستہ آہستہ ان کا دل اولاد کے لئے تڑپنے لگا۔

ایک دن خود ہی اس کا تذکرہ کر بیٹھا۔ ”بڑھاپے میں میں اپنے گھر بیٹے کا منہ نہ دیکھ سکوں گا۔“

”اس کے لئے تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کا ذمہ میں اپنے سر لیتی ہوں۔“

روپا کے خیال میں ایک دوشیزہ قابل شادی تھی۔ اسے یاد

کر کے وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔

مدن نے کہا ”میری ملازمت ہے۔ تم ہو۔ نئی بیوی کو بہلانے کی فرصت اور خواہش نہیں ہے۔“

”روپا نے کئی دفعہ کہا ”اس کے لئے تمہیں ایک منٹ بھی ضائع نہ کرنا ہوگا۔ اور آخر کار دل لگی کے طور پر کہا ”اچھا اُس وقت دیکھو گی مہنہاری فرصت“

ایک نو عمر سے بچی عمر کے مدن کی شادی ہو گئی۔ اس کا نام تھا۔
”کیلا“

مدن نے سوچا کہ نام بھی بہت اچھا ہے۔ اور چہرہ بھی خوبصورت ہے۔ وہ اس کی ہر ادھر دیوانہ ہو گیا۔ ہر وقت اسی کے پاس بیٹھنے کی خواہش رہنے لگی۔ مگر روپا کے سامنے اپنی سب خواہشات کو دہانا ہی پڑتا۔ ظاہر طور پر تو وہ یہ دکھلا رہا تھا۔ کہ اس نے یہ شادی کر کے مصیبت مول لی ہے۔

روپا۔۔۔ مدن کے خیالات کو بھانپ گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ کئی دفعہ اس نے مدن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”بھلا کتنے کہاں ہو۔ یہ چھوٹی سی بیوی اچھی نہیں لگتی؟“

”اُس وقت مدن اور بھی بے رُخی دکھلا کر کہتا۔ ”ارے چھوڑو

مجھے بہت ضروری کام ہے۔“
 روپا ہنس کر دروازہ روک کر کہتی: ”آج تم بھاگ کر نہیں جا
 سکتے۔“

بے بس ہو کر مرن کو بیٹھنا ہی پڑتا۔
 روپا اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہتی تھی: ”غیر لڑکی کو
 گھرا کر اس سے بدسلوکی مناسب نہیں ہے۔“
 یہ کہہ کر لیلا کو زبردستی مرن کے پاس بٹھلاتی۔ اور اس کا گھونگٹ
 کھول کر اور منہ اونچا کر کے مرن سے کہتی: ”دیکھو کیسا چاند سا
 چہرہ ہے۔“

روپا کسی دن تو دونوں کو ایک جگہ بٹھلا کر اور خود کوئی بہانہ کر کے
 باہر چلی جاتی۔ اور باہر سے دروازہ بند کر دیتی۔ مگر مرن جانتا تھا کہ
 دروازہ کے سوراخوں سے ضرور کسی کی دو آنکھیں پوشیدہ طور پر اُسے
 دیکھ رہی ہوں گی۔ اس لئے وہ اُس دل سے لیلا کی طرف کر دٹ
 لے کر سونے کا بہانہ کرتا۔ اور لیلا گھونگٹ نکالے ایک طرف سر نہنچا
 کئے اس تماشا کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔

آخر کار روپا نے لاچار ہو کر اس بات کو چھوڑ دیا۔ جب روپا
 نے ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ تو مرن اس طرف راغب ہوا۔ جیسے ایک پیر

کا ٹکڑا ملنے پر اُسے گھما پھرا کر دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ ویسے ہی بڑے
کو اس اُدھیر عمر میں ایسی دوشیزہ ملنے سے اُسے لمحہ بھر کے لئے بھی
چھوڑنا مشکل ہو گیا۔

مدن کو اس سے قبل کبھی ایسا پریشاں نہ ملا تھا۔ پہلے جب
شادی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ نادان تھا۔ جب جوانی آئی۔ تو
رُدا پا اس کے لئے ایک دیرینہ جان پہچان والی تھی۔ رُدا پا سے اُسے
محبت ضرور تھی۔ لیکن کبھی اس کے دل میں حال کی طرح جذبات نہ
آئے تھے۔

کبھی کبھی پوشیدہ طور پر لیلیا کے لئے پھل مٹھائی۔ وغیرہ بازار
سے لاتا۔ اسی طرح دونوں میں محبت بڑھنے لگی ایک دن رُدا پا نے
گھر کے کام کاج سے چھٹی پا کر کمرہ کے دروازوں سے دیکھا۔ دونوں
بیٹھے ہوئے چوپٹ کھیل رہے ہیں۔ بوڑھالے کا ہی کھیل ہے۔

میں ہر روز انکو دیکھ کر خوش ہوتی ہوں۔ مگر پھر بھی یہ۔
— اُسے سوچا انکو کھیلنے کی دغا بازی کی کیا ضرورت تھی۔ جیسے
اچانک ہی کسی نے جلتی ہوئی سلاخ سے رُدا پا کی آنکھیں کھول دے
اور اس کی آنکھیں پر غم ہو گئیں۔

رُدا پا نے دل میں کہا۔۔۔ میں نے ہی مجبور کر کے شاد

کہہ ادی۔ میں نے ہی دودل بلا دیئے۔ اور پھر مجھ سے ہی یہ دھوکا بازی۔ جیسے میں ہی ان کے عیش و عشرت میں ایک کاشا ہوں۔
 روپا۔۔۔ لیلہ کو گھر کا کام کاج سکھلاتی تھی۔ ایک دن
 مدن نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔۔۔ وہ ابھی بچہ ہے۔ تم
 اُس سے بہت مشقت لیتی ہو۔ اس میں اتنی طاقت نہیں ہے۔
 روپا کو بہت غصہ آیا۔ مگر اپنے کو قابو میں رکھ کر بالکل خاموش
 رہی۔

اُس دن سے روپا نے لیلہ کو گھر کے کسی کام میں بھی ہاتھ لگانے
 دیا۔ کھانا وغیرہ سب خود ہی بناتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ لیلہ مالکن
 کی طرح بیٹھی رہتی۔ اور روپا ایک نوکرانی کی طرح اس کی خدمت
 کرتی۔ روپا جب چپ چاپ گھر کا سب کام کرنے لگی۔ تو وہ فخر محسوس کرتی
 تھی۔ اس کے دل میں کوئی حسد نہ تھا۔ اس نے دل میں کہا۔۔۔
 ”تم دونوں بچے مل کر کھیلو۔۔۔ گھر کا سب کام کاج میں دیکھ لو گئی۔“

ہائے۔۔۔ آج کہاں گئی۔ وہ طاقت جس کے بھر دے پر
 روپا نے سوچا تھا کہ وہ خاوند کے لئے۔ اس کی سزت کے لئے۔
 اپنی محبت کا آدھا حق بغیر کسی ہچکچاہٹ کے چھوڑ دے گی۔ کیا ایک اہل دن

پورنیا کی رات کو جب دل میں محبت کی لہریں اٹھتی ہیں۔ تب انسان اپنی خواہشات کے سامنے کسی کو نہیں سمجھتا۔ تب جب وہ بڑی بھاری قربانی کرنے کی ٹھان لیتا۔ مگر محبت بھری لہروں سے بچنے کے لئے دل کو کام میں نہیں لاسکتا ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ انسان بہت ہی کمزور ہے۔

بہت دنوں کی کمزوری کے بعد کمزور دُنيا اس دن شکل کش کے چاند کی طرح ایک لائن سی معلوم پڑتی تھی۔ وہ دُنیا میں بہت ہی بے عزت ہو کر اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اگر کچھ بھی نہ ہو تو میرا کام چل سکتا ہے۔ لیکن اب اب وہ توانا تھی۔ رگوں میں بھرے خون آگیا تھا۔ اس دن اس کے دل نے کہا۔۔۔ کہ تم نے جوش میں آکر اپنی محبت کی قربانی دے دی ہے۔ مگر اب وہ اپنا دعوے نہیں چھوڑ سکتی۔

رُودپالے جن دن اپنی حالت کو سمجھ لیا تھا۔ اسی دن اپنا کمرہ بیلا اور من کے لئے خالی کر دیا۔ اور خود ایک دوسری کوٹھری بن رہے تھے۔

پندرہ برس کی عمر میں پہلی دفعہ میں پنگ پر قدم رکھا تھا۔ آج میں برس بعد اسے ہمیشہ کے لئے یلا کے حوالے کر دیا۔

گلی کے موڑ پر ایک نوجوان گانا گارہا تھا۔ اس کا ساتھی بانسری بجا رہا تھا۔ یہ گانا بجانا۔ اس چاندنی رات میں پاس کے کمرہ میں پڑے ہوئے مدن کو بہت ہی پسند آیا۔ یہاں اس وقت میٹھی نیند میں سو رہی تھی۔ اور دن بار بار ”پیار سی کیا سو گئی“ کہہ کر اس کی متوالی آنکھوں کو نیند سے محروم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مدن کے ہڑھاپے میں۔ جوانی کا جوش مارتا ہوا سمندر پر پوشیدہ تھا۔ موقع پا کر وہ اچانک ہی بے وقت ٹی برس ہو گیا۔ مگر اس کی جوانی کا جواب دینے کو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ اسی سبب سے اُس کے گھر کا انتظام الٹ پلٹ ہو گیا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ انسان کے دل کی حالت کیساں نہیں رہتی۔

صرف مدن کا ہی یہ حال نہ تھا۔ بلکہ رُودپا کو بھی ایک نئی حالت سے گزرننا پڑا۔ آج دل جو کرے تو چاہتا ہے۔ اُسے اس نے اور کبھی نہیں پایا۔ اور نہ کبھی چاہا ہے۔ جب شریف آدمیوں کی طرح مدن ہر روز دفتر جاتا تھا۔ اور سونے کے پہلے کچھ دیر تک گھر کے کام کاج کے متعلق کچھ بات چیت کرتا تھا۔ تب تو اس گھریلو لڑائی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ رُودپا کو چاہتا تو ضرور تھا۔ مگر اس چاہنے میں جوش نہ تھا۔

آج رویا کو معلوم ہوا کہ اُسے کوئی زندگی کے لطفوں سے دور رکھے ہوئے ہے۔ اس کا دل ہمیشہ سے مڑ جھایا ہوا ہے۔ اس کی زندگی بڑی ہی غریبی سے کٹی ہے۔ اُس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گھر کے کام کاج میں ایک نوکرائی کی طرح گزار دیا۔ آج اس نے محسوس کیا۔ اُس کی کوٹھڑی کے پاس ایک کمرہ میں عیش و عشرت کے سامانوں کا تالہ بڑی بے دردی سے توڑا گیا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی گھر کی مالک بنی بیٹھی ہے۔ عورت کا فرض خاوند کی خدمت کرنا تو ضرور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ گھر کی رانی بھی ہے۔ لیکن اس میں حصہ دار بنا کر ایک عورت رانی اور دوسری خدمت گار ہوئی۔ اس سے نوکرائی کا فخر قائم نہ رہا۔ اور رانی کا آرام نہ رہا۔

کیونکہ لیلہ کو اپنی اپنی خواہشات و بانی پڑیں۔ لگاتار اتنی زیادہ عزت پا کر وہ اپنے کو بھول گئی۔ اُسے کسی کی عزت کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ سمندر کی طرف بہنے کی بجائے سمندر میں بہنے ہی میں دریا کو فائدہ ہے۔ لیکن اگر کہیں دریا میں بہنے لگے۔ تو دریا کا نقصان ہی ہے۔ اس سے دریا ٹھیک راستہ پر نہ جا کر ادھر ادھر سے چل کر پاس رہنے والوں کو تباہ کر دے گا۔ بدن اپنے دل کی سب محبت لے کر دن رات لیلہ کو روت و نہنہ نکا۔ اس سے لیلہ غور و غماز آگئے۔ اور انہماک سے حارقہ

آگے ہی بھل گئی۔ خاوند کو چاہئے۔ اُس کی عزت کرنے کا وقت ہی اسے
 نہ ملا۔ اُس نے خیال کیا کہ ”سب کچھ میرے لئے ہی ہے۔ اور میں کسی
 کے لئے بھی نہیں ہوں۔“

ایک دن بادل خوب زور سے گھرے ہوئے تھے۔ آندھی اتنے
 زور سے چل رہی تھی۔ کہ گھر کے اندر کوئی کام کرنا ناممکن تھا۔ باہر بارش
 ہو رہی تھی۔ بڑے درخت کے پاس کا گھاس پانی میں ٹوٹ گیا تھا۔
 روپا اکبلی کو ٹھڑی میں بیٹھی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔
 اسی وقت مدن چور کی طرح آہستہ آہستہ کھوٹھڑی میں آیا۔
 وہاں آکر وہ الجھن میں پڑ گیا۔ کہ روپا کے پاس چلوں یا واپس لوٹ
 جاؤں۔ روپا نے اس کی اس حرکت پر دھیان دیا۔ مگر خاموش رہی۔
 تب مدن یکایک تیز کی طرح سیدھا اُس کے پاس پہنچا۔ اور
 پہنچتے ہی بولا۔ ”کچھ زیوروں کی ضرورت ہے۔ قرضہ بہت چڑھ گیا ہے۔
 مہاجن اس کے لئے بہت بے عزت کر رہے ہیں۔ کچھ چیزیں گرومی کھنی
 ہوں گی۔“

روپا نے کچھ جواب نہ دیا۔ مدن چور کی طرح کھڑا ہوا۔ آخر
 بولا۔ ”کیا آج دے سکتی ہو؟“

روپا نے کہا سب ”نہیں“

روپا کی کوٹھڑی میں جانا جیسے مشکل تھا۔ ویسے ہی اب دن کھینٹے
ہا ہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ دن نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”اچھا تو کسی اور جگہ
کچھ بندوبست کرنے جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیدھر ضد کس سے لیا ہے۔
اور کسے زیورات دینے ہو گئے۔ یہ بات روپا کو ابھی طرح معلوم تھی۔
اس نے سنا تھا۔ رات کو لیٹا دن سے تن کر کہا تھا سب ”روپا
کے پس اتنے زیور ہیں۔ مگر مجھے ایک بھی نہیں ملتا“

دن کے چلے جانے کے بعد روپا نے لیٹا کو بلایا۔ صندوق
کھول کر ایک ایک زیور نکالا۔ اور پھر اپنی شادی کی بنارسی ساڑھی
لیٹا کو پہنائی۔ اور اس کے بعد سر سے لے کر پاؤں تک کے ایک
ایک زیور اسے پہنا دیئے۔ یہ سب کچھ کر کے جب روپا نے لیٹا کو
ایک بار دیکھا۔ تو وہ بہت ہی خوبصورت دکھائی دی
لیٹا جب سب زیور پہن کر وہاں سے چھم چھم کرتی ہوئی چلی گئی۔
تب بہت دیر تک یہ چھم چھم کی آواز روپا کے ریشہ ریشہ میں گونجنے
لگی۔ روپا نے اپنے دل میں کہا۔۔۔ اور کس بات میں میرا اور تیرا
مقابلہ ہوگا۔ ایک وقت تھا۔ جب میں بھی تیری طرح جوان تھی۔۔۔
میری لہوں میں بھی جوانی پھوٹ رہی تھی۔ لیکن مجھے کسی نے پریم نہیں کیا۔

مگر تو ہے۔ کہ مجھ سے ایک بات کئے بغیر ہی یہاں سے
چلی گئی۔

رُو پا جیب صرف گھر گھر سستی کو ہی سب کچھ جانتی تھی۔ تب یہ زیور
اُس کی نگاہ میں بڑے قیمتی تھے۔ اُس وقت بھلا وہ یہ زیور کسی کو ایسے
ہی دے دیتی؛ لیکن اس وقت اُسے ان سب چیزوں سے نفرت سی
ہو گئی تھی۔

زیور پہن کر بیدا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے دم بھر کے لئے
بھی نہ سوچا۔ کہ رُو پا نے کسے کیا دے دیا ہے۔ اس نے
سوچا۔ سب دولت اور سب عیش و آرام کی میں ہی مالک ہوں
کیونکہ وہ اپنے خاوند کی چاہتی ہو ہی ہوں۔

کچھ لوگ عشق میں پھنس کر بُرا بھلا نہیں سوچتے۔ انہیں کچھ بھی
نہیں معلوم پڑتا۔ وہ مصیبت کے بے رحم ہاتھوں میں خود بخود چلے
جاتے ہیں اور آخر اس کے انجام پر آنکھیں کھلتی ہیں۔
نادانِ مدن کی بھی یہی حالت ہوئی۔ لیلیا اس کی زندگی تھی۔
رُوح تھی۔ وہ اس کے لئے پاگل سا تھا۔ صرف مدن کی آمدنی سے ہی
اب لیلیا کے اخراجات پورے نہ ہو سکتے تھے۔ بلکہ پوشیدہ طور پر دفتر

کے کیش میں سے آہستہ آہستہ ضرورت پوری کرنے کے لئے بھی روپے آنے لگے۔ دن یہی سوچنا — کیا ہوا اگلے ماہ کی تنخواہ اس میں ڈال دیں گے۔ لیکن تنخواہ ہاتھ آتے ہی نہ معلوم کہاں غائب ہو جاتی۔ اسی طرح آہستہ آہستہ کیش میں سے بہت سی رقم کم ہو گئی۔

آخر ایک دن رات فاش ہو گیا۔ بہت دیر کی ملازمت تھی۔ صاحب اس کو چاہتے تھے۔ انہوں نے دن کو کمی پوری کرنے کیلئے صرف دو دن کی ہمت دی۔

کس طرح کیش سے تین ہزار روپے غائب ہو گئے۔ یہ بات سوچنے پر بھی دن نہ سمجھ سکا۔ ایک دم پاگل کی طرح بھاگتا ہوا۔ وہ روپا کی کوٹھڑی میں گھسا۔ روپا کے پاس جا کر کہنے لگا ”غضب ہو گیا۔“ سب معاملہ سن کر روپا کا چہرہ اتر گیا۔ دن نے کہا۔ ”جلدی زیور نکالو۔“

روپا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مگر میں نے تو سب زیور پہلا کو دے دیئے ہیں۔“

دن بچوں کی طرح پریشانی کی حالت میں رو کر بولا ”تم نے اُسے کیوں دے دیئے؟ کیوں دیئے تمہیں کس نے دینے کو کہا تھا؟“

رُوپا نے اُس کا ٹھیک جواب دے کر کہا ”تو اس میں نقصان
 ہی کیا ہوا؟ وہ زیور کہیں پہلے تھوڑے گئے ہیں؟“
 ڈرپوک مدن نے بھری آواز سے کہا ”ہاں۔ اگر تم کوئی مہبانہ
 کر کے اس سے زیور نکال لو۔ تو اچھی بات ہے۔ لیکن تمہیں میری
 قسم۔ اُس سے یہ نہ کہنا کہ میں زیور مانگ رہا ہوں۔“
 تب رُوپا نے نفرت سے کہا ”کیا یہی تمہارے مہبانہ بازی کا
 وقت ہے۔ چلو“

یہ کہہ کر رُوپا خاوند کو ساتھ لے کر لیلا کے کمرے میں گئی۔ لیلا
 نے ایک بات نہ سنی۔ ہر بات کا یہی ایک جواب دیا۔ ”میں کچھ
 نہیں کر سکتی۔“

دُنیا کی کوئی فکر اسے کرنی ہوگی۔ خاوند کی بُرائی۔ بھلائی پر
 دھیان دینا ہوگا۔ ایسا وعدہ تو اُس نے کبھی نہ کیا ہوگا۔ سب اپنی
 اپنی فکر کریں۔ اور لیلا کے آرام کا خیال رکھیں۔ ایسا ہی ہونا چاہئے۔
 تب مدن لیلا کے پاؤں پکڑ کر رونے لگا۔ لیکن لیلا نے اس کے
 جواب میں صرف یہی کہا۔ ”یہ سب کچھ میں نہیں جانتی۔ میں اپنی چیز
 واپس نہیں کر سکتی۔“

مدن نے دیکھا۔ یہ دُہلی پتلی خوبصورت بیوی لوہے سے بھی

سخت ہے۔ مصیبت کے وقت خاوند کی ایسی کمزوری دیکھ کر روپانے
نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اُس نے لیلہ سے زبردستی چابیاں چھیننے کی
کوشش کی۔ مگر چالاک لیلہ نے چابیاں باہر تالاب میں پھینک دیں۔
روپانے بے وقوف خاوند سے کہا ”دیکھتے کیا ہو۔ تالاکوں
نہیں توڑ داتے؟“

لیلہ نے کہا ”توئیں پھانسی لے لوں گی“
مدن نے کہا ”رہنے دو۔ میں ایک اور طریقہ سے کیش پورا
کر دوں گا۔“

وہ پاگلوں کی طرح باہر بھاگ گیا۔ دو گھنٹہ کے اندر اندر مدن
نے اپنا جیدی مکان تین ہزار میں فروخت کر ڈالا۔
بہت مشکل سے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں رُک گئیں۔ لیکن ملازمت
سلامت نہ رہ سکی۔ اب تمام جائیداد میں سے ڈوبویاں رہ گئیں۔
اُن میں سے لیلہ حاملہ ہو کر بالکل ہی چارپائی پر پڑ گئی۔ اب مدن
نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔

لیلہ کی بے صبری اور تکلیف بڑھ گئی۔ وہ کسی طرح بھی یہ نہ سمجھنا
چاہتی تھی کہ اُس میں اپنے خاوند پر بھروسہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے۔

تو اس نے شادی کیوں کی تھی؟

مکان کی بالائی منزل میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں لیلا اور مدن کی رہائش تھی اور دوسرے میں رُویا رہتی تھی۔ لیلا ہمیشہ یہی کہتی تھی: "اس گندے اور چھوٹے سے گھر میں رہ نہیں سکتی۔" مدن جھوٹ ہی کہتا "گھبراؤ مت۔ میں جلد ہی ہی دوسرا مکان بدل لے گا۔" تلاش کر رہا ہوں؟

لیلا کہتی: "کیوں یہ پاس ہی تو بڑا مکان ہے۔ لیلا جب پہلے مکان میں رہتی تھی تب اُس کے ہمسایہ عورتوں سے بات تو کیا، کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ مدن کی گہری حالت دیکھ کر ایک روز محلے کی دو عورتیں لیلا کے پاس آئیں۔ مگر لیلا کمرے کا گواڑ بند کئے۔ اندر بیٹھی رہی۔ در کسی حالت میں بھی کمرہ نہ کھولا۔ اُن کے چلے جانے کے بعد اُس نے رورو کر آسمان سر پہ اٹھالیا۔ اسی طرح کے جھگڑے روزانہ بڑھنے لگے۔ آخر کار لیلا کی صحت خراب ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کے حمل گرنے کا خطرہ ہو گیا۔

مدن نے ایک دن رُویا کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"تم ہی لیلا کو بچا سکتی ہو۔"

اُس دن آدمی رات گزرنے پر جب سارا تنہا بیٹھ خراٹے لے رہا تھا۔ مرن آہستہ آہستہ روپا کے کمرہ میں گیا۔ چپ چاپ ایک پائنگ پر لیٹ رہا۔ لیکن اُسے اپنے پڑانے حق کو حاصل کرنے کیلئے چور کی طرح کمرہ میں گھسنا پڑا۔

نہ تو روپا نے ہی کوئی بات کی اور نہ دن ہی کچھ بولا۔ دونوں جیسے پہلے پاس ہی سوتے تھے۔ ویسے ہی آج بھی سوئے۔ لیکن دونوں کے دلوں میں ایک ہونے والے لڑکے کی یاد تھی۔ اس کی رُوح اُن کے دلوں کو ترپا رہی تھی۔ دونوں کے دلوں میں ایک شعلہ غم روشن تھا۔

خواہش

میں تیرے لئے گیت گانے کو یہاں حاضر ہوں۔ تیرے اس منہ
کے ایک کونے میں میری جگہ ہے۔

تیری دنیا میں مجھے کوئی کام نہیں کرنا۔ میری اس زندگی سے
کچھ تائیں کبھی کبھی بے مطلب نکل سکتی ہیں۔

نصف شب کے اندھیرے مندر میں جب تیری اُپاسنا کا
گھنٹہ بجے تب مجھے گانے کے لئے اپنے مقابل کھڑے ہونے کی
اجازت عنایت کرنا۔

صبح کی ہوا میں جب سنہری پن کا ساز ملایا جاتا ہے۔
تب اپنی سیوا میں حاضر ہونے کی اجازت دے کر میری عزت کو
دوبالا کرنا۔

شعلہ چرخ

افسانہ نمبر ۷

مہمان

جب موت تمہارے دروازے کو کھٹکھٹائی گی تب تم اُسے
کیا نذر کرو گے ؟

پیاسے میں اپنے مہمان کے آگے اپنی زندگی کا بریز جام رکھ
دوں گا۔ میں اُسے خالی ہاتھ کبھی نہ جانے دوں گا۔

جب آخری وقت میں موت میرے دروازے کو کھٹکھٹائی گی
تو میں گرام کی شیریں پیداوار بسنت کی تمام راتوں کے پھل پھول اور
اپنے شبِ روز کے کام اور اپنی زندگی کے تمام نشیب و فراز یکجا
کر کے اس سے آگے رکھ دوں گا۔

شعلہ چرغ

دو ہزار سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ مگدھ کے راجہ یم سار نے مہاتما بدھ کی خدمت میں عرض گزاری کہ اگر حضرت کے مقدس پاؤں کا ایک ادنیٰ سا ذرہ ناخن حاصل ہو جائے۔ تو میں بے حد سکھی ہو جاؤں۔

”اس ذرہ ناخن کو حاصل کر کے دنیا میں کس طرح کی قیامت لا جا رہا ہے ہو راجہ جی؟“ مہاتما بدھ نے استفسار کیا۔

”میں ایک عمل۔ عدم تشدد اور راستی کے لئے روحانی تقویت کے لئے چاہتا ہوں۔“ راجہ نے جواب دیا۔

شاہی باغیچہ کے ایک کناسے پر ہم سارے نے مہتاب دھ کے ذرہ
 ناخن کو کاڑ کر اس پر ایک خوبصورت ستون تعمیر کرایا۔ صناعوں نے
 ایک دلکش مصوری سے اس کو چار چاند لگا دیئے۔ اور ایسا معلوم
 ہوتا تھا۔ سنگ مرمر کے بت ابھی بول اٹھیں گے۔ اپنے ہی جن پر
 شیدا ہو کر محورِ قص ہو جائیں گے۔ اس قدر دل آویز تھی۔ صناعوں
 کی کارگزاری۔

ہر روز گہری شام کے وقت راجہ اور شاہی دوستیزائیں غسل
 فرماتیں اور بعد میں مقدس کپڑے زیب تن کر کے پھولوں کی طشتری میں
 سامان پرستش یک جا کرتیں پھر سونے کے ایک بڑے طشتے میں دینا
 پرستش کر کے مقدس ستون کے قریب جاتی تھیں۔ ستون کے قریب تمام
 شب پھولوں کی ایک مالا ہرک چھوڑ دیتی تھی۔ سونے کے ان چراغوں
 کی شعائیں جن سے آرتی کا کام لیا جاتا تھا۔ علی الصبح تک نور افشاں
 رہتی تھیں پرستش کے ان ہر دو اوقات میں نئے پھول لگے چراغ
 اور عبارت کے لئے ہرنیا ساز و سامان تیار کیا جاتا تھا۔
 تاکہ اپنے دیوتا کی نظر عنایت سے فیض یابی حاصل کی
 جائے۔

مگر اب نئے مہاراج نے آتے ہی تباہی مچا دی۔ خون کی

ندیابں بہاگر اپنے باپ کے دھرم کا قیمتیہ کر دیا۔ اور بدھ دھرم کے
شاہستروں کو یگ کی لہاتی ہوئی آتشیں آتش میں ڈال دیا گیا۔ سلطنت
بھر میں منادی کرادی گئی۔ پرستش کرانے کے لئے یہ تین مخصوص
چیزیں ہی وقف ہیں۔

وید۔ براہمن اور راجہ۔

اور جو کوئی کسی چوتھی چیز کی پرستش کرے گا۔ تختہ وار پر لٹکا دیا
جائے گا۔

اہل سلطنت کانپ اٹھے۔ بدھ کے نام تک کی رٹارٹ بنا ہو گئی
جگہ بجگہ ویدوں کے یگ کی آتشیں آہوتی تباہی تباہی کرتی ہوئیں
فلک بوس ہونے لگیں۔

ایک روز شام کا واقعہ ہے۔ ایک شاہی دوشیزہ تبلیغ مقدسہ کی
مخصوص حسینہ غسل لے کر تیار کر رہی تھی۔ پھول اور دیئے بھی تیار کر
لئے گئے تھے۔ شاہی دوشیزہ کے لبوں پر مہاتما بدھ کا نام تھا۔ جو نرم
کی صدا کو لئے فضائے لطیف میں گونج رہا تھا۔

یہ عورت کواں ہے؟ کیا اسے راجہ کا خوف نہیں ہے؟ کیا اسے

شاہی منادی کا علم نہیں ہے؟

اس کا نام ہے شرمستی۔ اور یہ ایک شاہی کنیز ہے۔ جن کا کام

ہے۔ شاہی تبلیغ کی خدمت گزاری بہ روز جب شاہی خاندان کی مہارانی عبادت کے لئے مہماتی تھیں۔ تب شریعتی بھی جو کہ علم سے بے بہرہ اور گنوار و شیزہ تھی۔ شاہی مہارانیوں کے ساتھ عبادت کی نقل کیا کرتی تھی۔ ان کے ہمراہ مقام مقدسہ پر جا کر یہ گنوار و شیزہ ایک کنا سے کی طرف کھڑی ہو جاتی۔ بیشک اُسے کچھ نہیں آتا تھا۔ تو بھی آنکھیں بند کر دے کچھ نہ کچھ رٹا کرتی تھی۔ جیسے کہ اس کی باتوں کو کوئی اندر ہی اندر سے سن رہا ہو۔

اُس نے شاہی منادی سنی تھی۔ سامان پر متمش لے کر۔ یہ گنوار و شیزہ راج ماتا کے پاس آکر کہنے لگی۔ "ماتا وقت عبادت ہے۔" مہارانی راج ماتا کا جسم ہر تھرا اٹھا۔ خوفزدہ ہو کر اُس نے کہا نادان! جانتی نہیں، ستون پر دھوپ دیپ رکھنے والے کو پھانسی ملے گی۔ یا کالا پانی ہو گا۔ اے بیوقوف داسی بھاگ جا بھاگ جا۔ اب سے عبادت کا نام بھی نہ لینا۔ جا بھاگ یہاں سے۔

وہاں سے لوٹ کر گنوار و شیزہ راج رانی شری رتا دیو سی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ قد آدم آئینہ جیسی ہیرے جو اہرات آویزاں تھے۔ اور جن کی جھاریں لٹک رہی تھیں۔ ٹھیک اس آئینہ کے مقابل کھڑی ہو کر راج رانی سنور نے میں مصروف تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے

اپنے بالوں کی چیری میں مانگ بھر رہی تھی۔ سندھو سے موتی ڈال رہی تھی۔

گنوار دوشیزہ کے ہاتھوں دینائے زیبائش دیکھ کر راج رانی چونک اٹھی۔ ہاتھ ہل جانے سے اس کی مانگ ٹیڑھی ہو گئی۔ داسی نے کہا۔ "رانی جی وقتِ عبادت ہے۔"

رانی نے کہا۔ "اس کے ساتھ وقت اجل بھی۔ نکل جایہاں سے کوئی دیکھ لے گا۔ اور اجہ جی کا غصہ جاگ اٹھے گا۔ عبادت کے روز تو چلے گئے۔"

راج محل کی کھڑکی سے نکل کر آفتاب کی آڑ میں جلتے ہوئے آفتاب کو گھورتی ہوئی راجکمار کی شکنتلا نظموں کی ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی۔ جھانجھ کی جھنکار سن کر اس نے دروازے کی طرف نگاہ کی تو دیکھا۔ گنوار دوشیزہ شرمیلی شاہی کینز کھڑی ہے۔ "راجکمار سی۔ چلو عبادت کے لئے چلو۔"

"تو ہی جامرنے کے لئے" شکنتلا بولی۔

شہر کے دروازے پر جا کر شرمیلی گنوار دوشیزہ نے پکار لگائی شہر میں بسنے والو بھگوان کی عبادت کا وقت ہو گیا۔ چلو۔ کیا کوئی نہیں چلے گا؟ کیا راجہ جی کا خوف اس قدر دانتیگر ہے۔ کیا جان

اس قدر زیادہ عزیز ہے۔

کسی نے بھی اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ اور کوئی بھی جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ہر ایک کو خطرہ تھا۔ دوشیزہ ایک گہری شام کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں کوئی آواز نہ رہا تھا۔

وقت ضائع ہو رہا ہے۔ بیٹی شرمیلی دیر نہ کرو۔ اور حسینہ کا منہ کسی روحانی جلوے سے چمک اٹھا۔ وہ ستون کی طرف بڑھی۔

دن کی آخری روشنی اتالیکی میں جذب ہونے لگی تھی۔ اور اب ہر طرف اندھیرا سا ہو گیا۔ لوگوں کا ہجوم بازاروں میں کچھ کم ہو گیا تھا۔ یکایک سلطنت کے شاہی مقام جہاں ہر روز چراغ بجائے جاتے تھے، ٹھیک اسی جگہ سے کوئی دیئے روشن کرنے میں مشغول تھا۔ رات ہو گئی۔ شدت کی سرخی محسوس ہو رہی تھی۔ اس مقام پر شمعیں جگ اٹھیں۔ شاہی دربان نے ہماراج کے حکم کے مطابق اہل کے نزدیک جا کر اونچی آواز میں کہا: "عبادت ختم کرو۔"

اسی وقت نقارے پرچوت لگے۔ اہل سلطنت یکبارگی کیوں متوجہ ہو گئے۔ تمام پہرے دار ستون کے قریب آئے۔ یہ جو خونیاں یا کوئی بھوت نہیں نہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ شاہی باغیچے کے درمیان

میں گہری تاریکی کے بیچ اس مقدس ستون کے قریب کوئی ویلا
روشن کرنے میں مصروف ہے۔

ننگی شمشیریں لے کر شہر کے محافظ بھاگے آئے۔ ستون کے قریب
آکر دیکھتے ہیں۔ کہ ایک عورت ستون کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی
ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ اور عبادت کرتے ہوئے اس
کے لبوں پر مسکراہٹ سی ناچ رہی ہے۔

شہر کے بڑے محافظ نے اس خود کھوئے جسم کو خوب جھنجھوڑا
اور کہا "موت کو پیشانی پر اٹھا کر اس جگہ آرتی کرنے والی اوبھنسیب
تو کون ہے؟"

"میرا نام ہے شریتی۔ میں ہوں بھگوان کی مقدس خدمت
گزار داسی۔"

ننگی شمشیر اس گنوار سادہ لوح حسین و شیرازہ کی گردن پر
پلٹ پڑی۔ مقدس ستون کے قریب کی وہ سرزمین اس دن اس کے
خون سے سُرخ ہو کر اور بھی زیادہ مقدس ہو گئی۔

موسم ہوا کی اس تاریک اور گہری غیر آباد شب کے سفسان
ماحول میں۔ شاہی باغیچے کے ایک گوشہ میں عالم تنہائی میں کھڑے
صرف اس مقدس ستون کے قدموں میں آرتی کے چراغ کا وہ

آخری چراغ بھی خاموش ہو گیا۔ لیکن اس پرستارہ۔ اس عابدہ
 کے اندرونی چراغ کا شعلہ تو عرصہ لا محدود تک بھی خاموش رہ کر
 سمجھنے کے قابل نہیں۔

شعلهء حیل

افسانہ نمبر

تحفہ الفت

اے پاگل ! اپنے ہی کندھوں پر خود ہی چڑھنے کی کوشش
اے بھکاری ! اپنے ہی دروازے پر خیرات مانگنا۔

اپنے تمام بوجھ اس کے ہاتھوں پر چھوڑ دے۔ جو سب اٹھا
سکتا ہے۔ اور تکلیف میں پیچھے کبھی نہیں دیکھتا۔

جس چراغ کو تیری خواہش چمکتی ہے۔ اس کی روشنی کو یک دم
گل کر دیتی ہے۔ وہ ناپاک ہے۔ اس کے ناپاک ہاتھوں سے کوئی
چیز مت لینا۔ صرف اسی کو منظور کرنا۔ جو چیز محبت سے
دستیاب ہو۔

شعلہ اجل

نریش اپنے ہم عمر لڑکوں میں سردار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی پارٹی کا ہر ممبر اس کے ہر جائز و ناجائز حکم پر جان قربان کر دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ نریش کا دماغ شیطان کا کارخانہ تھا۔ اس میں ہر وقت کوئی نہ کوئی شرارت ہی ظہور پزیر ہوتی رہتی تھی۔ حسب معمول وہ اور اس کے ساتھی سمندر کے کنارے کھیل کود میں مست تھے۔ لب ساحل ایک بہت بڑا لکڑی کا شہتیرا ہوا تھا۔ تمام لڑکے اس کے گرد جمع تھے۔ اور آپس میں لڑنے کے کھیل میں مشغول تھے۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ میں اپنے مخالف کو پکڑ لوں۔۔۔

بیکایک جوش نے نریش کی زبان پر اگر سب کو حکم دیا "میرے پیارے
 بھائیو! آؤ ہم سب مل کر اس شہتیر کو جو کہ زمین کی چھاتی پر بڑا
 بھاری یو جھڑا ہے۔ جس کی درد سے ریت بھی رو رہی ہے۔
 اس کو پانی میں بہا دیں۔ اور جب اس کا مالک آئے۔ وہ دیکھ کر
 زہریلے سانپ کی طرح زہر اگلے۔ اور دیوانوں کی طرح پانگلوں کی
 طرح چیخ دیچار کرے اور ہم سب اس کی پھبتی اڑائیں۔ اس کا منوں
 اڑائیں۔"

اس حکم کے پاتے ہی ہر ایک کے دل دماغ میں مسرت کی
 ایک لہر موجزن ہو گئی۔ اور سب نے مل کر قہقہے لگانے شروع کر
 دیے۔ سب نے خوشی ظاہر کی غرضیکہ چند منٹوں میں بہا و سپاہیوں
 کی طرح مرنے مارنے کے لئے تیار ہو گئے۔

یکے بعد دیگرے سب شہداء کی مکھیوں کی طرح اس شہتیر کے
 ارد گرد گھڑے ہو گئے کہ اپنے میں نریش کا بھائی سب یو گندر جو کہ
 شرافت کا ایک حقیقی نمونہ تھا۔ بجلی کی طرح نمودار ہوا۔ اس کی رگ
 رگ میں شرافت، عقلمندی اور حمیت جھلکتی تھی۔ اور اس کے
 برعکس نریش دوسرا شیطان تھا۔ اس کی رگ رگ میں شرافت کوٹ
 کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یو گندر نے بارعب نظر سے ان کوں کو دیکھا

ان کے حواس خطا ہو گئے۔ اب کاتو تو ان کے بدن میں لہو کا نام نشا
 بھی نہیں سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اور ان کے بازوؤں
 نے جواب دے دیا۔ اب کریں تو کیا کریں۔ آخر لاچار ہو کر رڑکوں کو
 بغیر تکلیف دے جھٹ پٹ اس شہتیر پہ بیٹھ گیا۔

پھر ایک دو نے بل کر یوگندر کو اپنے ارادے سے باز
 رکھنے کے لئے اور خود کو کامیاب بنانے کے لئے محبت سے
 کہا۔ پھر سختی سے جب پھر بھی مقصد میں پورے نہ آئے۔ تو
 تنگ آکر اس کو دھکا دیا۔ مگر یوگندر ایک بڑے بھاری پہاڑ کی
 طرح بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہٹا۔ بلکہ اس
 نے اپنے آپ کو اور بھی مضبوط بنالیا۔ اس حالت کو دیکھ کر زلیش
 کی آنکھیں خون کتبہ ہو گئیں۔ کرودھ دیتا نے اپنا پورا جلال دکھایا
 اور ایک بھاری اجگر کی طرح پھسکاریں مارتے ہوئے کہا۔

”یوگندر۔ تم ہمیشہ ہر ایک کام میں روڑا اٹکایا کرتے ہو میں
 تمہارے اس سودا سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔ اس لئے یہاں سے
 چلے جاؤ۔ ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔ — مجھے تمہارے
 ساتھ زبردستی کرنی پڑے گی۔“

یوگندر کے بدن پر چوک تک نہ رہی۔ بلکہ مقابلہ آوہ اپنے آپ کو

اور زیادہ ہوشیار کرنے لگا۔ نریش نے اپنے چھوٹے بھائی کو اور زیادہ ہوشیار دیکھا۔ تو اس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔۔۔۔۔

ساون بھادوں کے آسمان کی طرح اس کے چہرے کی حالت ہونے لگی۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ وہ "قبر درویش برجان درویش خون جگر پینے لگا۔ اس کے ہاتھوں نے یوگندر کو سزا دینے سے صاف انکار کر دیا۔ پاؤں نے زمین کو چھوڑنے کا خیال چھوڑ دیا۔ اب نریش کو ناچار دوسرا سخت حکم ہی دینا پڑا۔ اور کہا: "اگر نہیں اٹھتا۔ تو شہر کو اس کے ساتھ ہی یا نیس دھکیل دو۔"

تمام اڑکیوں نے سر تسلیم خم کیا۔ اور مل کہ اس شہتیر کو پانی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

یوگندر کی آنکھیں خون کبوتر ہو گئیں۔ اس نے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔ خبردار اگر کسی نے لکڑی کو ہاتھ لگایا تو ہاتھ توڑ دوں گا۔ مگر زرش کے دوسرے حکم نے سب لڑکوں کو پھر تازہ دم کر دیا۔ سب نے مل کر آخر لکڑی کو دھکیل ہی دیا۔ یوگندر رونے لگا۔ منہ زمین پر آ رہا۔ اُسے سخت چوٹ آئی۔ سر پھٹ گیا۔ مگر نہ ہی زرش کو اور نہ ہی اُس کے ساتھیوں کو کسی قسم کا فکر تھا۔ یوگندر نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ زرش جیسے منہوں

الافریض ہوتا ہے۔ زمین پاؤں سے نکل گئی۔ خوشی غمی میں تبدیل
 ہو گئی۔ سامانِ حیات کو برباد کرنے کے بعد فلکیں انسان کی طرح
 ریش بھی افسردگی کی حالت میں تھا۔ اور آئندہ باتوں کے لئے سوچ
 لے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ اس کو دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ تھی۔
 اتنے میں یوگندر بھو کے شیر کی طرح اٹھا۔ آنسوؤں کا دریا بہتا
 ہوا۔ سمندر کی بے قرار لہروں کی طرح تھا۔ اور بجلی کی طرح چمکتا
 ہوا۔ آن واحد میں زرخ پر جاگرا۔ اس کو زخمی کر ڈالا۔ وہ بیچارہ
 زرخ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ مگر یوگندر — جو کہ ایک فداکار
 تھا۔ کا جوشِ جنون کم نہ ہوا۔ گرے ہوئے بھائی پُرکانوں کی
 ردی۔ جب ذرا شنانی کی جھلک نمودار ہوئی۔ غصے کو شکست دینا
 ہوا۔ آٹھ آٹھ آنسو روتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہوا۔

زرخ غم خزاں رسیدہ بلبل کی طرح اپنی شوئے قسمت پر نالہ کر رہا تھا
 اُس کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ کس دنیا میں کس جگہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ ہتھکوں کی
 نیکیوں نے تشکوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ جس نے اس کے شیطانی دماغ
 میں فلاسفی بھری شروع کر دی۔ اور اس کو ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ گویا
 اس کو اس کی قیمت سے کہیں۔ سینکڑوں کوس کی مسافت پر پہلے جایا
 جا رہا ہے۔ اتنے میں ایک آنے والی کشتی نے اس کی خیالی دنیا کو دم

برہم کر دیا۔ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہی اس کے جذبوں کو بہا دیا۔ بکشتی مٹی۔
تو اس میں ایک آدمی جس کے سر کے بال بھورے رنگ۔ مگر داڑھی اور
موچھیں سیاہ تھیں۔ زمین پر سر کے درخت کی مانند کھڑا ہو گیا۔

”بیٹا چکرورتی خاندان کی جائے رہائش کہاں ہے۔“ اس ادھیڑ عمر
انسان نے نریش کو کہا۔ اب نریش نے بجائے جواب دینے کے سرواہ بھری۔
اور چپ رہا۔ اجنبی نے دوبارہ۔ سہ بارہ دریافت کیا۔ اور پلای بھی دیا۔
مگر نریش۔ زندگی سے بے قرار نریش ہر بار ادھورہ سا جواب دے دیتا غرضیکہ
اجنبی کو اپنا سامنہ بے جانا پڑا۔ اجنبی دل ہی دل میں اس کی زندگی پر نفرت
کا اظہار کرنے لگا۔ اسی اثنا میں گھر سے ایک ملازم باہر نکلا۔ اور نریش
کو اس کی ماما کا پیغام دیا کہ جس حالت میں ہو۔ فوراً گھر پہنچ جاؤ۔ مگر
نریش اپنی ہی دنیا میں رہنا چاہتا تھا۔ اُس کو گھر جانا کسی بھی طرح
منظور نہ تھا۔ خوف تھا۔ جس کی وجہ سے اُس نے گھر جانے سے بالکل کورا
جواب دے دیا۔ مگر باوجود انکار کرنے کے اسے زبردستی پکڑ کر گھر کو لے
چلا۔ نریش نے ہر چند کوشش کی کہ اس کے فولادی پنجوں سے کسی نہ
کسی طرح رہائی پا جاؤں۔ مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔
”نریش تم نے آج پھر لوگنڈر کو مارا ہے۔ آؤ! آج میں تمہاری
دُرگت بنانی ہوں۔“ ماں نے کہا۔

”ماتا! میں ایشور کو گواہ دیتا ہوں۔ کہ میں نے آج یوگنند رکو بالکل نہیں مارا۔ بلکہ“ اس لفظ کے اس کی آنکھوں نے ایک اٹھا ہندی بہادی۔

”اب یہ رو دھو کر تپا بننا چاہتا ہے۔ ماتا جی! اس نے ہی مجھے مارا ہے۔“ یوگنند نے باؤرب آواز میں کہا۔

نریش جو اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھا۔ اس کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ برداشت کی حد ہو گئی۔ اب وہی نریش جس پر کر دھو کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ایک فحشی شیر کی طرح اس پر جھپٹا۔ اور یوگنند پر ٹکوں کی ایک بہت بھاری بارش شروع کر دی۔ جس سے وہ بیہوش ہونے لگا۔ مگر نریش ہی کہتا تھا۔ کہ ”پہلے نہیں۔ اب مارتا ہوں۔ اچھا! یہ جھوٹ بولنے کا پھل ہے۔ جتنا تم سے ڈرتا ہوں۔ اتنا ہی تو سر چڑھتا ہے۔“

ماں بچے کی یہ حالت نہ دیکھ سکی۔ اس نے نریش پر حملہ کر دیا۔ اور اب اس کو دیسی مار پڑنے لگی۔ مگر نریش نے اپنی سابقہ عادت کو بدل دیا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ یوگنند رکو جھوڑا ماتا کی طرف ہو گیا۔ ماں ایسی حالت دیکھ سخت حیران ہوئی اور بچوں کی طرح زار و زار رونے لگی۔

اسی اثناء میں وہ مجھ سے رنگ کے بالوں والا اجنبی اندر آیا۔
 اود جرائگی کی حالت میں کہنے لگا: ”یہ کیا خوب نریش نے اس اجنبی
 کو دیکھا تو ایسا شرمندہ ہوا۔ کہ کاش اس کو زمین جگہ دیتی تو اس
 میں سما جاتا۔ وہ دل ہی دل میں دُعائیں مانگنے لگا۔ کہ یا خدا اب
 میں نہ رہوں۔ اپنی قہر آلودہ بجلی کو میرے خربس ہستی کو تباہ و
 برباد کرنے کے لئے بھیج دو۔ یا ملک الموت کے فرشتے کو بھیج دو۔ لیکن
 اُدھر اُس کی ماں نے اپنے دیور کو پہچان لیا۔ جھٹ پٹ اپنے آپ کو دہشت
 کیا۔ اُنسواری کی بجائے خوش۔ بہت خوش ہو گئی۔ اود کہا۔ ”آبا۔ میں
 قربان جاؤں۔ جو تم نے درشن دیئے۔ آج بہت ہی اچھا دن ہے۔
 جو آپ نے آنے کی تکلیف گوارہ کی۔ بیٹھ جلیئے۔

اس کے دیور ترلوک نے نہایت عزت سے اپنی
 بھاوج کے چہروں میں سیس جھکایا۔ اور بھائی کی ناگہان موت
 پر زار زار اُنسو بہانے لگا۔ اب دونوں طرف سے اُنسو بجی نہیاں
 نہنے لگیں۔ اس کی تھوڑی دیر اود بچوں کے نالہ نے بھی نالوں
 کا کام دیا۔ جب ذرا فراغت پائی۔ تو اُدھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں
 ایک روز ترلوک ناتھ نے اپنی بھاوج سے دریافت کیا۔
 ”نریش اود یوگندر کی کیسے گذشتی ہے؟“ نریش دوسرا شیطان

اس کی رگ رگ میں شرارت پیکتی ہے۔ گتلاخ۔ سمست الوجود ہے
 مگر اس کے برعکس یوگندر ایک دیوتا ہے۔ شرانت کا جذبہ اس کو
 دورث میں ملا ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کروں۔ اتنی ہی تھوڑی
 ہے۔ اُس کی بھادو نے سر داکھ بھر کر کہا۔ یہ بات سن کر تو ترلوک
 کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ اور محبت امیز بھج میں پرار تھنا کرنے لگا
 ”اگر آپ برا محسوس نہ کریں۔ تو میں نریش کو ساتھ لے جاؤں۔ اور
 وہاں پر اپنے لڑکوں کیساتھ اس کو تعلیم دلاؤں۔ اُن کی صحبت سے
 یہ بہت اچھا ہو جائے گا۔ اس کی بھادو کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔
 ایک بڑا بھاری بوجھ سر سے اٹھنے والا تھا۔ اُس کی مراد ہرائی۔ اب
 نریش سے پوچھنے لگی۔ ”نریش۔ تم نے اپنے چچا جان کی باتیں سن لیں ہیں
 اور کہوں۔ ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ اس سے سب خوش و خرم رہیں گے“
 ”ماتا جی۔ میں کب انکار کر سکتا ہوں۔ میں بہت ہی خوش ہوں۔ کہ ایسے
 ساتھ چلا جاؤں۔ ضرور جاؤں گا ماتا جی ضرور جاؤں گا۔“ نریش نے
 خوشی خوشی کہا۔

یوگندر اوسماں اب خوش خوش رہنے لگے گویا اس کی مصیبتوں
 کا اب خاتمہ ہو گیا ہے۔ دنیا بھر کی تمام خوشی اسی کے لیے وقف
 کر دی گئی ہے۔ مگر کبھی کبھی بیٹے کے جدا ہونے کے غم سے اُس کو

بہت بے چینی ہوتی جس سے وہ تڑپنے لگتی
مگر تھوڑی دیر کے بعد سوچ کے پانی سے اُس پنس کو بکاتی۔ جس سے
اُسی کے دل کو شانتی نصیب ہوتی۔

اب نریش کو اٹھتے بیٹھتے کھاتے۔ پیتے غرضیکہ برگڑی یہی
فکر دامنیگو تھی۔ کہ وہ کونسی مبارک ساعت ہوگی۔ وہ اپنے آپ کو
کلکتہ میں پائے گا۔ ہر وقت اسی میں رہنا اسی دروان میں اُس
نے اپنی تمام یونہی۔ شغل کے سامان۔ سب کچھ اپنے چھوٹے
بھائی یوگندر کو دے دیئے۔ اب دونوں میں چکورا اور چاند جیسی
محبت پیدا ہو گئی۔

کلکتہ پہنچتے ہی پہنچتے وہ خوشی کے سمندر میں کئی بار غسل کرتا رہا۔
آئندہ سرسبز باغ میں سیر و تفریح کا سامان بناتا رہا۔ مگر اس وقت جب کہ وہ
اپنی چچی جان کے سامنے ہوا۔ تو اُس کی خوشی کا فور ہو گئی۔ رنج و غم
کے بادل پائے۔ اُس کا گلاب جیسا چہرہ دُر مہا گیا۔ کیونکہ اس کی
چچی اس کے آنے سے بہت دغیبہ ہو گئی۔ اس کی ناک
بھوں کو دیکھ کر نریش کے سینے پر ایک چھری چل گئی :-

نریش دین بدین کمزور ہوتا گیا۔ ہر وقت اسی خلش میں
مبتلا رہتا۔ کہ میں کیوں چچی جان کے لئے بوجھ بن رہا ہوں۔

کوئی وقت نہ پاتا۔ اس کے مقابل تمام ہوشیا اور لائق تھے پھر
 یہی تھا۔ جو سب کی نظروں میں گر اہوا تھا۔ اس نے بھی بڑی بے رحمی سے
 مار تے تھے۔ لڑکے طعنہ دیتے تھے۔ آوازے کتے تھے۔
 قسمت کا مار انا لہ وگیاں رہتا تھا۔ اور اپنی شوٹی تقدیر پر گرتا تھا۔
 رات کو بیٹھے ہوئے نریش نے ہمت سے ... دل کو کڑا
 کر کے کہا۔ ”چاچا جی۔ میرا دل یہاں تو اس رہتا ہے۔“

”ماہ اکتوبر میں تم کو رخصتیں ہونے والی ہیں چند دن ٹھہر جاؤ۔“
 اس کے چچا نے جواب دیا۔ نریش نے ایک آہ سرد بھری اور رات
 کی خاموشی میں خاموش ہو گیا۔

ایک دن کسی لڑکے نے نریش کو تنگ کرنے کی خاطر اس کی کتاب
 کو چھڑا لیا۔ اب اس بے چارے کے لئے اور مصیبت کا سامنا کرنا
 پڑا۔ جس حال میں کتاب موجود ہوتی تھی۔ تو وہ پھر بھی سبق یاد نہ
 کرتا تھا۔ مگر اب کتاب بھی نثار دے۔ تو پھر اس کے لئے سبق کا یاد
 کرنا بالکل غیر ممکن سا ہو گیا۔ اب اس کو سکول میں مار بہت پڑنے
 لگی۔ کہ اس کی مجردانہ حالت پر سب کو رحم اور ترس آ جاتا۔ مگر
 بعد ازاں سب لڑکے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے اور اتنا
 رد لاتے۔ ستاتے کہ اس کے چچا زاد بھائی بھی دوسروں کے ہم خیال

ہو جائے۔ پھر فیض ایک سہ ہزار دالامعاہ ہو جاتا۔ نریش دیوانہ پاگل ہو گیا۔ ہر وقت رونے دھونے میں گزرتی۔ آخر کار مایوسانہ انداز میں اپنی بے بس چھی صاحبہ پر ظاہر کر دی۔ چھی صاحبہ سن کر بھوکے شیرنی کی طرح گر بنے لگی۔ اتنے میں اس کی اولاد نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ جس سے اس نے نریش کو خوب مارا اور کروک کر کہا۔ ”بے حیا۔ بے شرم۔ بے وقوف لڑکے تو اتنا لاپرواہ ہو گیا ہے۔ کہ تجھے اپنی کتابوں کی خبر نہیں ہے۔ جاؤ اپنی ڈاین ماں کو کہو۔ کہ وہ تم کو کتابیں لے دے۔ میرے پاس تمہارے لئے کوئی پیسہ نہیں ہے۔ میرا اپنا خرچ زیادہ ہے۔ وہ ہی پورا انہیں ہوتا۔ جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ۔“

اس رات کو نریش نے کچھ کھایا نہ پیا۔ اسی طرح بستر سے پروراز ہو گیا۔ یعنی کے بادلوں نے گھیر کر اس کو طیر یا بخار کی گود میں دے دیا سر پر چکر دے کا بھوت سوار ہو گیا۔ جس سے سر دماغ سب جسم چور چور ہونے لگا۔ اس کا کون تھا۔ جو اس کی مدد کرتا۔ اس کی وہاں پر ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کا ایک منٹ کا پھرنا بھی چھی جان کے لئے قیامت برپا کر دینے والا تھا۔ اس کی لگاتار دُعاؤں کا آج نریش پر پورا اثر ہو چکا تھا۔ اس کو اپنے بدن کی بھی ہوش نہ تھی۔

جب کبھی ہوش آتی - تو اپنے آپ کو درد سے بے قرار پاتا - اور اُٹھ اُٹھ کر چچی جان کے آگے ہاتھ ہاتھ جوڑتا - کہ اس دفعہ معاف کر دو پھر ایسی غلطی نہ کروں گا - خدا کے لئے مُعاف کر دو چچی جان - اگر تم مجھ کو مُعاف کر دو گی - تو میرا پاک خدا تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا - اور پھر ایسا نہ حالت میں بچوں کی طرح رونے لگتا - خیر جی طرح رات گزر گئی -

صبح ہوئی - ضروری حاجات سے فارغ ہو کر ترلوک ناتھ دسترخوان پر آگیا - نریش کو کھانے کی میسر سے گم پا کر اس کے دل میں کاٹسا جھجھکیا - اپنی بیوی سے اس کی غیر ماضی کی وجہ پوچھی - اس نے بہت بُرا بھلا کہا - آخر ترلوک ناتھ خودی بے قراری کی حالت میں اُٹھا - اس کی تلاش کی - بعد مشکل اس کو بستر سے پردہ ہوش پایا - ترلوک ناتھ نے اس کا ہاتھ دیکھا تو گھبرا گیا - کیونکہ اس پر بخار کا شدید حملہ ہو گیا تھا - اس کی آنکھوں کے آگے اندھیل ہی اندھیرا چھا گیا تھا - تمام جسم پر لرزہ طاری ہو گیا - اتنے میں نریش نے آنکھیں کھولیں - تو اس کی جان میں جان آئی - ”نریش بیٹا اُٹھو“ ترلوک نے رس بھری آواز میں کہا -

”بچی جی نہ مارو - اب کی دفعہ مُعاف کر دو - دیکھو - ہاتھ جوڑنا

ہوں۔“ یہ کہہ کر نریش دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ نبض ساکن ہو گئی۔ ترلوک کو جان کے لائے پڑ گئے۔ فوراً ایک ڈاکٹر کو بلا لیا۔ اس نے دیکھ کر دوائی دی۔ جس سے کسی قدر بخار ہلکا ہوا۔ مگر پھر بھی جب نریش کو ہوش آئی یہی پکارتا ————— ”میں جاتا ہوں۔ اب نہ مارو۔ خدا کے لئے نہ مارو۔“

دوسرے دن نریش کی صحت کچھ قدرے اچھی ہو گئی۔ مگر اس کی آنکھیں کسی شے کو ڈھونڈنے لگیں۔ جب اس کو نہ پاتیں تو سرد آہوں کی رفتار جاری ہوتی تو آنکھوں سے ایک دریا بہنے لگتا۔ مگر آج چپ چاپ تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ترلوک ناتھ اندر ہی اندر گھل رہا تھا۔ دیوی دیوتاؤں کے آگے منتیں مان رہا تھا۔ ایشور اور بھگوان سے اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہاں گیا تھا۔ سولے ماؤسی نے کچھ نہ تھا۔ آخر کار تنگ آکر اس کے کان میں کہا۔ ”میں نے تمہاری والدہ اور بھائی یوگندر کو بلا بھیجا ہے وہ بہت جلد آنے والے ہیں۔“

سورج غروب ہوا۔ شام ہوئی۔ ڈاکٹر کی انتظار ختم ہوئی۔ ڈاکٹر نے مریض کو دیکھتے ہی حسرت بھری آوازیں کہا کہ ایشور رحم کرے۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ شاید رات تک —

نریش ادھی آواز سے کہو اس کرنے لگا۔ وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔
 ساٹے۔۔۔ ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ تین چار۔۔۔ بچاؤ
 بچاؤ۔۔۔ خدا کے لئے بچاؤ۔۔۔“

اتنے میں اس کی ماما اور اس کا چھوٹا بھائی یوگندر آگئے۔ انہوں
 نے نریش کی حالت دیکھی۔ توں کی آنکھوں میں ایک سیلاب اُٹھ پڑا۔
 تروک ناتھ نے ہر چند حوصلہ دیا۔ مگر بے سود۔ آخر کار اس کی ماں
 نریش کی چار بیٹی پر گری۔ جس سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اور
 ماں کو دیکھ کر اس کے سینے سے چپٹ گیا۔

”نریش۔ میرے پیارے بچے نریش۔ میری زندگی کا سرمایہ
 نریش اس کی ماما نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔
 ”کیا!“ نریش نے زور سے پکڑ کر کہا۔

”میرے پیارے بچے نریش! اب میں آگئی ہوں تم اب اچھے مو
 جاؤ گے۔“ اس کی ماں نے حوصلہ سے کہا۔

”نہیں ماما۔ میں اب اس دنیا میں نہیں رہوں گا۔ بلکہ وہاں جاؤں گا۔
 جہانگیر اپا گیا ہوا ہے۔ میں اسکی گود میں باقی ماندہ زندگی بسر کروں گا۔
 اتنے میں اس کی حالت یکدم گہر گئی۔ زبان بند ہو گئی۔ اور شعلہ اجل
 نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

شعله درخ

افسانه نمبر ۹

تیرے دروازے تک

تجھ سے ملنے کے لئے میں اکیلا نکلا تھا۔ مگر یہ کون ہے۔ جو اس
فلکت میں میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے؟

اُس سے بچنے کے لئے میں ادھر ادھر بٹ جاتا ہوں۔ مگر میں
اس سے پھیا چھڑا نہیں سکتا۔

وہ اپنی تیز اور بھاری چال سے زمین کی دھول اڑاتا ہے۔
وہ میری ہر آواز کے ساتھ زور سے بول اٹھتا ہے۔

وہ میری ہی حقیر آتما ہے۔ میرے پر بھو! شرم تو اس کے نزدیک
تک بھی نہیں آئی۔ مگر مجھے اُس کے ساتھ تمہارے دروازے پر
آنے میں شرم محسوس ہوتی ہے



شعلہٴ رخ

کئی حالتوں سے گزرنے کے بعد اُوہیٹر عمر لیا نے جس آدمی کا
 سہارا لیا تھا۔ وہ بھی جب اسے پھٹے کپڑے کی طرح جھوڑ گیا۔ تب اُسٹھی ہر
 اناج ڈھونڈنے کے لئے کوئی دوسرا گھڑا شش کرنے میں اُسے بہت نفرت
 ہوتی۔

جوانی کی آخری سیرھی پر موسمِ بہار کی طرح بہت ہی خوبصورت
 عمر آتی ہے۔ جب زندگی کا پھل پھلنے اور فصل پکنے لگتی ہے۔ اسوقت
 بسنت کی طرح بھری جوانی کی شوخیاں نہیں بھاتیں۔ اتنے دلوں میں
 گھرلو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ بُرائی۔ بھلائی۔ سُکھ۔ دکھ زندگی میں

حصہ لے کر منیر کو محبِ حالت میں پہنچا دیتے ہیں۔ اس وقت کسی نئے آدمی کو اپنے پرست کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ بلکہ بڑا ناماقت ہی اچھا معلوم بڑتا ہے۔

لیلا نے اپنی جوانی کی شب میں ایک دن صبح ہی اٹھ کر دیکھا کہ اس کا دوست رات کو اس کا تمام زیور، ادھیڑاٹھا کر لے گیا ہے۔ مکان کا کرایہ ادا کرے کو بھی ایک پیسہ موجود نہیں۔ دو برس کے بچے کو دودھ پلانے کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ جب لیلا نے سوچ کر دیکھا کہ اپنی چالیس برس کی عمر میں وہ ایک آدمی کو اپنا نہ بنا سکی۔ ایک گھر کے کونے میں بھی مرنے جینے کو بھی ٹھکانہ نہ کر سکی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ سچ پھر اُسو پو پو چھ کر دونوں آنکھوں میں گاجل لگانا ہو گا۔ ہونٹوں میں پان کی دھڑی جما کر اور چہرہ پر پوڈر لگا کر پھر سے بازار میں بیٹھنا ہو گا۔ مسکراہٹ کے ساتھ کسی نئے آدمی کا شکار کرنا ہو گا۔

تب وہ گھر کے دروازے بند کر کے زمین پر لوٹ کر سر زمین پر چپکنے لگی۔ دن بھر کچھ کھائے بغیر مردے کی طرح پڑی رہی۔ شام ہو گئی۔ روشنی کے بغیر گھرانہ حیرا ہو گیا۔ چانک ہی ایک پڑائے دو نے آکر دروازہ پھٹ پھٹ کر لیا کو پکارنا شروع کیا۔ لیلا آواز پہچان

کر ماتھ میں جھاڑو لے کر دروازہ کھول کر اس آدمی پر شیرنی کی طرح چھٹی۔
لادوہہ اجان بچا کر بھاگ نکلا۔

لیلا کا بچہ بھوک کے مارے رو رو کر چار پائی کے نیچے سو گیا تھا۔ وہ
بھی اس شور و غل سے جاگ اٹھا اور ماں ماں کہہ کر رونے لگا۔

تب لیلا اس روتے بچے کو چھاتی سے چپکا کر باہر دوڑی اور ایک
کوئیں میں گود پڑی۔

آواز سن کر پڑوسی ہاتھ میں روشنی لے کر وہاں پہنچے۔ لیلا اور اس کا
بچہ کنوئیں سے نکال لیا گیا۔ لیلا اس وقت بیہوش تھی اور بچہ مر چکا تھا۔
مہسپتال میں جا کر لیلا تندرست ہو گئی۔ خود کشی اور ایک جان کئے
تلف کرنے کے الزام میں مجسٹریٹ نے اسے سشن سپرد کر دیا۔

سشن جج بالو کندن لعل تھے۔ اُن کے حکم لیلا کو پھانسی کی
سزا ہوئی۔ بد قسمت کی عمر کا خیال کرتے ہوئے وکیلوں نے اسے بچانے
کی بہت کوشش کی۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پھانسی کی سزا بحال رہی۔

کندن لال ایک طرف تو ہندو عورتوں کو دیوی کا رتبہ دیتے
ہیں اور دوسری طرف عورت ذات کو قابل اعتبار نہیں کہتے۔ ان کا
عقیدہ ہے کہ ہندو لڑکیاں اپنے خاندانوں کی پابندیاں اور اصول
توڑنے کو ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ اگر سماج۔ ہندو سماج کا پرہیز

ہم دیا جائے تو ایک بھی خاندانی عورت سماج کے پھرے میں نہ ملے گی۔
 اُن کے ایسے خیال کا ایک سبب بھی ہے۔ وہ سبب جانے کیلئے
 گنڈن لال کی جوانی کا کچھ حال جانتا ضروری ہے:-

گنڈن لال جب کالج کے سیکنڈ ایئر میں تھے۔ تب ان کے خیالات
 اور پسند ناپ ڈھنگ کی تھی۔ سونے کا چہمہ۔ فیشن ایپل دائرہ سی اور انگریزی
 فیشن کے بال ان کو بہت پسند تھے۔ اس وقت زیبا لیش پر زیادہ رعب
 تھے۔ شراب۔ گوشت سے کوئی پرہیز نہ تھا۔ اور اسی کے ساتھ ایک آدھ
 اور عادتیں بھی تھیں۔ لیکن اب اُن کے سر پر چوٹی ٹپے۔ اور روزانہ اپنے
 ہاتھ سے جماعت کر کے صفائی کا مونہ پیش کرتے ہیں

ان کے گھر کے پاس ہی ایک اور خاندان رہتا تھا۔ ان کے راجھا
 نام کی ایک بیوہ لڑکی تھی۔ اس کی عمر اس وقت قریباً ۱۶ سال تھی۔

سمندر میں سفر کرتے ہوئے۔ کنارے کی جو بہار دکھائی دیتی ہے
 وہ کنارے پہنچنے پر دکھائی نہیں دیتی۔ بیوگی کی آڑ سے رادھا دینا سے
 جتنی دُور چلی گئی تھی۔ اسے وہ راحت کا گھر سمجھتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی
 کہ اس ظالم دُنیا سے جتنا دُور چلی گئی ہے۔ اتنا ہی اُسے دُنیا سے محبت ہو
 گئی ہے۔ اسے وہ راحت کا گھر سمجھتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس دُنیا
 کے پُورے بہت ہی سخت لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس

ظالم دنیا میں چلنا ایک مچھل میں کشتی پر چلنے کی طرح بالکل آسان ہے سبب
دستے سیدھے ہیں۔ راحت اس کے گھر کے در پر کھڑی ہے۔ اور جوانی اس
کے کانپتے ہوئے دل کے اندر ٹھانٹھیں مار رہی ہے۔ جوانی کی مست ہوا
نے اُسے بھلا دیا تھا۔ تمام نیلگوں آسمان۔ جیسے اُسی کی جوانی کی لہروں
سے بھر پور تھا۔ اور زمین اُسی کے جو بن کی خوشبو سے ہلک رہی تھی۔
گھر میں اس کے ماں باپ اور دو چھوٹے بھائیوں کے علاوہ اور
کوئی نہ تھا۔ دونوں بھائی صبح کھاپی کر سکول چلے جاتے تھے۔ اور سکول سے
واپسی پر کھانا کھا کر نائٹ سکول میں چلے جاتے تھے۔ باپ کی تنخواہ کم تھی۔
اس لئے گھر میں ماسٹر کھنے کی توفیق نہ تھی۔

کام سے فرصت پا کر رادھا اپنے کمرے کی کھڑکی میں آ بیٹھی۔ بیٹھے
بیٹھے لوگوں کی آمد و رفت دیکھا کرتی تھی۔ خواجہ دالے طرح طرح کی آوازیں
لگاتے اور اپنا سامان بیچتے تھے۔ اُس کو سن کر وہ سمجھتی تھی کہ خواجہ دالے راجپور
اور فقیر بہت راحت میں ہیں۔

صبح ادرتیسرے پہر شام کو غوب بن ٹھن کر کندن بھی چھاتی اُبھار کر اسکی
نغروں سے گزرتے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس نوجوان کے سب کچھ ہے ماور
اسے سب کچھ دیا جاسکتا ہے۔ لڑکیاں جیسے کھلونوں کی زیبائش کر کے
کھیلتی ہیں۔ ویسے ہی رادھا کندن لال کو دل ہی دل میں سب طرح سے

سجھا کر دیوتا سمجھ کر کھلتی تھی۔
 کبھی کبھی شام کو وہ دیکھتی تھی کہ گنڈن لال کے گھر میں خوب روشنی
 ہے۔ ناچنے گانے والی کے گھنگرؤوں کی آواز سے کمرہ گونج اٹھتا ہے اُس
 رات کو وہ گنڈن لال کی کھڑکیوں میں سے سایہ دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں ہی
 ختم کر دیتی تھی۔ جوانی کی خواہشات ایک پھرے میں بند پرستکی طرح دل پر
 چوٹیں پہنچاتی ہیں۔

رادھا۔ اپنے دیوتا کو عیش میں ڈوبے رہنے کے سبب سے اپنے
 دل میں کوسئی تھی یا اُسے نفرت کرتی تھی؟ نہیں چراغ جیسے اپنی روشنی دکھلا
 کر پردے کو اپنی طرف لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ویسے ہی گنڈن لال
 کا گانے بجانے کا شغل رادھا کو اپنی طرف راغب کر رہا تھا۔ وہ زیادہ
 رات تک اکیل بیٹھی اُس کے گھر کی گونج کو سنا کرتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی
 کہ اس کے مقابل اس گھر کے اندر۔۔۔ اس مجلس کے درمیان
 ۔۔۔ ایک نہایت پراگندہ جال بچھا ہے۔ جو رادھا کو دُور سے ایسے
 دکھلائی دیتا تھا۔ کہ اس رات کے اندر ایک پتھروں کی ہنسی نفرت کی
 لہریں لہرا رہی ہے۔

رادھا اپنے سنان مکرو میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اپنے ملی دیوتا
 کے لئے اپنی تمام زندگی ختم کر سکتی تھی۔

بد قسمت مادھا کی بد قسمتی سے اس کے دیوتا نے اس پر مہربانی کی
بہشت نے جب آکر دنیا قائم کی تو بہشت بھی برباد ہو گیا۔ اور جس نے اپنے
دماغ میں۔ اپنے دل میں دلی دیوتا کو جگہ دے کر تمام رات آنکھوں میں
گزاری تھی۔ اس کی عزت پر بھی بٹہ لگ گیا۔

اس بیوہ پر کب کندن لال کی نگاہ پڑی۔ اور کب اس کو غلط نام رکھ
کر خط لکھا۔ اور کب سے کئی قسم کے لالچ دے کر ٹھیس لایا۔ آخر کندن لال نے
بے مبر دل کی بے قراری سے بھرپور ایک خط پایا۔ اس کے بعد ایک دن
اچانک ہی نہ معلوم کس طرح اس دنیا سے کہیں دور چلی گئی۔

ایک دن آدھی رات کے وقت ماتا پتا اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر
رادھا کندن کے ساتھ کہیں ہال گئی۔ جب وہ کندن کے پاس بیٹھی تو شرم و
حیا نے اسے گھیر لیا۔۔۔ جیسے وہ مردہ ہو۔

آخر جب گاڑی چل دی تو رادھا رو کر کندن لال کے پاؤں پر گر
پڑی اور کہنے لگی۔۔۔ اچھی نہیں تمہارے پاؤں پرتی ہوں۔ تم مجھے میرے
گھر پہنچا دو۔ کندن لال نے جلدی سے اس کا ہنہ بند کر دیا۔ گاڑی تیزی
سے چلنے لگی۔

دریا میں ڈوب کر مرد ہے آدمی کو جیسے دم بھر میں زندگی کی سب
گذری باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ ویسے ہی اس بند گاڑی میں رادھا کو یاد

کھانے کے وقت اس کے والد بغیر اس کو کھانا نہ کھانے
تھے اور چھوٹے بھائی سکول سے آکر اس سے کھانا مانگتے تھے۔ اور یہ بھی
یاد آیا کہ صبح کو وہ اپنی ماں کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ اور شام کو ماں
اپنے ہاتھ سے اُس کے بال سنوارتی تھی۔ اُس وقت اسے یہ گاڑی دوندغ
کا پتھر معلوم ہونے لگا۔

وہ سوچنے لگی۔ دُنیا کے ہر گھر میں اس وقت ہر بشر سو رہا ہوگا۔ اسے
اپنے گھر میں اپنی چار پائی پر رات کے وقت بڑے آرام سے نیند آتی تھی۔
ہائے۔ یہ بات اُسے پہلے کیوں نہ یاد آئی۔ گھر لو عورتیں صبح اٹھ کر اپنی
گھریلو زندگی میں مصروف ہو جائیں گی۔ اور گھر سے نکلی ہوئی بد لغیب آواہ
رادھا کی رات کہاں جا کر ختم ہوگی۔ صبح جب سُورج کی کرنیں اس کے گھر
میں پڑیں گی۔ تب وہاں کیا ہوگا۔ بے شرمی کا چراغ خوب تیز روشنی پھینکے گا۔
لوگ مجھے کیا کیا نہ کہیں گے؟

رادھا بہت روتی۔ چلائی۔ بہت عاجز ہو کر اس نے کہا۔ ”ابھی
رات باقی ہے۔ میری ماں اور دونوں بھائی ابھی نیند میں ہوں گے۔ مجھے ابھی
گھر پہنچا دو۔“

جیسے جال میں پڑی ہوئی پھل تڑپ تڑپ کر خون کے آنسو روتی
ہے۔ مگر ہی گیر کے جسم پر جون تک نہیں رہ سکتی۔

بالکل دہی یا تکندن لال نے ادھر کان نہ دھرے۔ ایک سیکنڈ گلاس کسٹوبہ میں سوار کرا کر کہیں لے چلا۔

کندن لال کی زندگی میں سے صرف ایک واقعہ کا ہی ذکر کرتے ہیں بد اخلاقی کے خیال سے دوسرے واقعات کو پُرسِ قلم نہیں کیا گیا۔

اس وقت اُن دفنائے مُردوں کو نکالنے کی ضرورت نہیں۔ میں غلط نام رکھے ہوئے آدمی کا کچھ نام و نشان ہے یا نہیں لیکن اس وقت کندن لال پاک خیالات رکھتے ہوئے موجود ہے۔ وہ روزانہ پُوجا کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ ہارک باتیں کرتے ہیں۔ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی دھارمک تعلیم دیتے ہیں اپنی عورتوں کو بھی درپردہ ہی رکھتے ہیں۔ جہاں کسی غیر کی نگاہ نہ پڑ سکے۔ لیکن خود ایک وقت کئی دوشیزاؤں کی عصمت ٹوٹ چکے تھے۔ اسی سبب سے آج عورتوں کے سب سماجک گناہوں کی سخت سزا دیتے تھے۔

رادھا کو پھانسی کا حکم دینے کے دو دن بعد کندن لال جیل خانہ کے باغ تشریف لے گئے۔ اس وقت انہیں دیکھنے کی بڑی خواہش ہوئی کہ آیا رادھا اپنے گناہوں کا کفارہ کر رہی ہے یا نہیں۔ میں میں جہاں عورتیں قید رکھی جاتی تھیں۔ وہ وہاں پہنچے۔

دُور سے انہیں لڑائی جھگڑنے کا شور سنائی دیا۔ اندر جا کر دیکھا کہ رادھا پہرے داروں سے جھگڑ رہی ہے۔ کندن لال اپنے دل میں

ہلے۔ سوچا عورتوں کی عادت ہی ایسی ہوتی ہے۔ موت سر پر موجود ہے۔ تو بھی لڑنا نہیں چھوڑتیں۔ یہ شاید مر کر بھی فرشتہ موت سے جھگڑے بغیر نہ رہیں گی۔

کندن لال نے سوچا اس وقت کو شش کر کے رادھا کو اپنے گناہوں کا کفار اگنے کے لئے مجبور کرنا چاہئے۔ اسی خیال سے جب وہ رادھا کے پاس پہنچے۔ ویسے ہی رادھا ہاتھ جوڑ کر بولی: ”جج صاحب۔ دُہائی ہے آپ کی۔ اس سے کہیں کہ میری انگوٹھی مجھے دیدے“

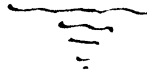
پوچھنے سے معلوم ہوا کہ رادھا کے بالوں میں۔ ایک انگوٹھی چھپی ہوئی تھی۔ اچانک ہی سیاہی کی نظر اس پر پڑی اور اس نے اسے چھین لیا۔

کندن لال پھر بھی ہنسے۔ کل پھانسی مل جائے گی۔ تب بھی انگوٹھی کی تمنا نہیں جاتی۔ زیور ہی عورتوں کا سب کچھ ہے۔

پہرے دار سے کندن لال نے کہا ”کہاں ہے وہ انگوٹھی“ پہریدار نے انگوٹھی انہیں دیدی۔

جیسے کسی نے جلتا ہوا کوئلہ کندن لال کے ہاتھ میں رکھ دیا ہو۔ اس طرح وہ چونک پڑے۔ انگوٹھی میں ایک طرف ہاتھی دانت پر ایک نوجوان کی فوٹو تھی اور دوسری طرف نام۔

تب کُندن لال نے انگوٹھی سے نگاہ ہٹا کر رادھا کی طرف دیکھا۔
 پچیس برس پہلے کی بات یاد آگئی۔ ”ہیں یہ تو وہی ہے۔“
 کُندن لال نے پھر ایک بار اس انگوٹھی کو دیکھا اور اس کے بعد
 آہستہ آہستہ سر اٹھایا جب اُن کی نگاہ رادھا پر پڑی۔ تب رادھا
 کائنات کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ اور کُندن لال اس کے شعلہ رخ کی
 تاب نہ لا کر باہر چلے گئے۔



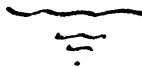
نزدیک مگر دور

وہ آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ مگر میں بیدار نہ ہوا۔ مجھ بد قسمت کی اس نیند کو لعنت ہے۔

وہ ایسے وقت آیا۔ جب رات کا سناٹا تھا۔ اس کی بین اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کی مدھر راگینوں سے میری نیند معمور ہو گئی۔

ہائے میری راتیں اس طرح کیوں منائع ہوتی ہیں ؟

ارے میں اس کے درشن سے کیوں محروم رہتا ہوں۔ جس کی خوشبو میری نیند کو چھپکتی ہے۔ جو میرے اتنا نزدیک آ جاتا ہے۔



شعبياس

افغانه پښتانه

حقیقی وجود

جیسے میں اپنے نام سے پکارتا ہوں۔ وہ اس قید خانے میں رہا ہے۔ میں ہمیشہ اپنے سب اطراف ایک دیوار کے بنائے ہیں معروف رہتا ہوں۔ اور جوں جوں یہ دیوار اونچی ہوتی جاتی ہے۔ اس کے اندھیرے سایہ میں میرا حقیقی وجود میری آنکھوں سے اوجھل ہوتا جاتا ہے۔

میں اس بلند دیوار پر غرور کرتا ہوں۔ اور مٹی و ریت کا گارا اس پر لگاتا ہوں کہ کہیں اس دیوار میں معمولی سا سوراخ نہ رہ جائے۔ اور اس تمام فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ میرا حقیقی وجود میری نظر سے اوجھل ہوتا جاتا ہے۔

شعلہ یاس

دُنیا اور بہشت کے درمیان ایک اور خدائی حکومت ہے۔
 جس کی باگ ڈور ”راجہ نوشکر“ کے ہاتھ میں ہے۔ اس خوشنما اور
 عجیب سلطنت کا نام ہے۔ ”دھوتا تو ہو سکتا۔“ جن لوگوں نے دُنیا
 میں نیک کام کر کے عزت پائی ہے۔ اور جن لوگوں نے اپنی شان کی
 پروا نہ کرتے ہوئے مفلسوں اور محتاجوں کی بلا کسی خیال کے امداد کی ہے
 وہ بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کا نام دُنیا میں سورج
 کی طرح روشن ہے۔ اور رہے گا۔ لیکن جو لوگ تقدیر کے ہیر پھیر میں
 رہتے ہیں۔ ان کا کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔

ہمارے روشن بابو بھی اسی عادت میں مبتلا تھے۔ وہ نوجوان تھے سب کا یہی خیال تھا کہ اگر وہ خواہش کرتے۔ تو سبھی باتوں میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن کسی وقت بھی انہوں نے کوئی خواہش ظاہر نہ کی۔ اور نہ ہی کوشش کی۔ لیکن گھر میں سب کا خیال تھا کہ اگر روشن محنت کرے۔ تو امتحان میں اول نمبر پر پاس ہو گا۔ لیکن اُس نے امتحان ہی نہ دیا۔ یقین تھا۔ اگر وہ کسی محکمہ میں ملازمت کرتے تو اب تک کسی اعلیٰ عہدہ پر مامور ہوتے۔ مگر انہوں نے نوکری ہی نہ کی۔ عام لوگوں سے انہیں نفرت تھی۔ کیونکہ وہ عزت دار تھے۔ خاص لوگوں سے انہیں کوئی رشتہ کار نہ تھا۔ کیونکہ اگر وہ چاہتے۔ تو بھی وہ خاص آدمی بن سکتے تھے۔

روشن کی شادی ایک رئیس کی لڑکی سے ہوئی تھی اس کے لئے اُسے روزی کا فکر نہ تھا۔ وہ دولت مند سرور اور خوبصورت بیوی پا کر ایک قسم سے بے فکر تھا۔ بیوی کا نام تھا شکنتلا۔

بیوی کا یہ نام انہیں پسند نہ تھا۔ اور اسے بھی اپنے قابل نہ سمجھتے تھے۔ لیکن بیوی کے دل میں خاوند کی عزت تھی۔ سب عورتوں کے خاوندوں سے اس کے خاوند بہت لائق ہیں۔ اسی خیال سے وہ کچھ کمزور سی رہتی۔ اس کا خاوند بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔

شکنتلا کو ہر بات میں کھٹکا رہتا تھا کہ کہیں میرے خاوند کی عزت پر

بہ نہ لگ جائے۔ اور مجھے نیچا دکھینا پڑے۔ اُسے اپنے خاوند کی عزت کا خیال تھا۔ وہ اگر اپنے دل کی قربانی دے کر بھی اپنے خاوند کی خدمت کر سکتی تو تیار تھی۔ اسی میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتی تھی۔ اس کیلئے وہ سب کچھ بغیر کسی تکلیف کے کرنے کو تیار تھی۔

روشن جب کالج میں پڑھتا تھا۔ تو سرسرا میں ہی رہتا تھا۔ جب امتحان کا وقت آیا۔ تو وہ امتحان دینے نہ بیٹھا۔ اور دوسرے برس پڑھنا بھی چھوڑ دیا۔

اس واقع سے شکنتلا کے دل کو چوٹ پہنچی۔ ایک دن رات کو آہستہ سے اس نے اپنے خاوند سے کہا۔ ”امتحان دے ڈالتے تو اچھا ہی تھا۔“

روشن نے لاپرواہی سے ہنس کر کہا ”تو تمہارا خیال ہے۔ کہ امتحان دینے سے ہی لیاقت حاصل ہوتی ہے؟۔۔۔ ہمارے لام ناتھ بھی تو امتحان پاس کر چکے ہیں۔“

پڑوسن کھلا اپنی لڑکپن کی سہیلی شکنتلا کو اپنے بھائی کی تلاش کی امتحان میں کامیابی کی خوشخبری سنانے آئی۔ یہ سنتے ہی شکنتلا کے دل میں آیا۔ کہ یہ خوشی نہیں بلکہ مجھے طعنہ دینی کر رہی ہے۔ اسی لئے خوشی ظاہر نہ کر کے تنہائی سے بولی ”البتہ۔ اسے امتحان بھی کوئی امتحان ہے۔ یہاں تک

کہ ولایت کے بی۔ اے سے کم تو کوئی امتحان ہی نہیں ہے۔“

خوشخبری سنانے آتی ہوئی کلاس پہلے تو اپنی ہسپلی کی یہ بات سن کر حیران ہوئی۔ لیکن وہ بھی تو عورت تھی۔ اس نے شکستہ کی دلی باتوں کو بھانپ لیا۔ بھائی کی بے عزتی ہوتی دیکھ کر اسے بھی غصہ آگیا۔ اس نے کہا ”بہن میں ولایت تو گئی نہیں۔ اور نہ ہی میری شادی ولایت سے ہو آنے والے خاوند سے ہوئی ہے۔ میں یہ باتیں کیسے جان سکتی ہوں۔“

میں یوں عورت ٹھہری۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ بنگالی لڑکے کو ایف۔ اے کا امتحان دینا ہوتا ہے۔ اور وہ بھی سب نہیں دے سکتے۔“

یہ کہہ کر کلاسوں سے چلی گئی۔ لڑائی نہ بڑھانے کے سبب سے

شکستہ یہ سب کچھ سن کر اپنے کمرے میں جا کر خوب روئی

کچھ عرصہ بعد ایک دور رہنے والا خاندان کلکتہ میں شکستہ کے والد

کے ہاں ٹھہرا۔ جس سے شکستہ کے والد راجکار بابو کے ہاں بڑی دھوم

دھام ہوئی۔ روشن جن بڑے کمرے میں رہتے تھے۔ اس کو چند دنوں

کے لئے خالی کر کے کسی دوسرے کمرے میں رہنے کو کہا گیا۔

اس واقع سے روشن بہت ناراض ہوا۔ پہلے شکستہ کے پاس گیا۔

اس کے والد کی چٹنی کر کے۔ اسے بلا کر اپنا بدلہ لیا۔ اس کے بعد کھانا نہ کھایا

اور سب پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر شکستہ بہت ہی شرمندہ

ہوئی۔ اس نے اپنے خاوند کو ہاتھ جوڑ کر بڑی مشکل سے متانت سے راضی کیا۔

شکنتلا سمجھدار تھی۔ اس نے اپنے والدین کو قصور وار نہ ٹھہرایا۔ اُس نے سوچا۔۔۔ یہ بات کچھ بھی نہیں ہے ساتھ ہی یہ بات بھی اس کے دل میں آئی کہ اس کا خاوند سسرال میں رہ کر اپنی آبرو و خود بچ رہا ہے۔ اُس دن سے شکنتلا ہر روز اُسے کہنے لگی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔

روشن کے دل میں غرور تو بہت تھا مگر اپنی حالت کا خیال کچھ بھی نہ تھا۔ اپنے غریب گنبد میں واپس جانے میں وہ بالکل رضامند نہ تھا۔ تب شکنتلا نے مصمم ارادہ کر کے کہا: "اگر تم نہ جاؤ گے تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔"

روشن دل میں ناراض ہو کر اپنی عورت کو کلکتہ کے پاس باہر کی گاؤں میں اپنے کچے اور خستہ مکان میں لے جانے کی سوچنے لگا۔ سفر کے وقت شکنتلا کے والدین نے اپنی لڑکی سے کچھ دن اور میکے ٹھہرنے کو کہا۔ شکنتلا نے خاموش رہ کر اپنی نارضامندی ظاہر کر دی۔

اُس کا مصمم ارادہ دیکھ کر اس کے والدین کو شبہ ہوا کہ شاید بغیر علم کے اس کے دل کو کوئی جھوٹ پہنچائی گئی ہو۔ راجگمار نے بڑی نرمی سے

پوچھا ”بیٹی! کیا ہماری کسی بات سے ناراض ہو گئی ہو؟“
 شکنتلا نے اپنی ذلیل نگاہوں سے اپنے والد کی طرف دیکھ کر کہا۔
 ”کبھی نہیں۔ میں یہاں بڑے آرام سے رہی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ سچوں کی
 طرح رونے لگی۔ مگر اس کا ارادہ مصمم تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔
 والدین نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنے دل میں کہا۔ خواہ کتنے لاؤ۔
 پیار سے پرورش کرو۔ مگر شادی کے بعد لڑکی غیر ہو جاتی ہے۔
 آخر شکنتلا روتی ہوئی سب کو چھوڑ کر وہاں سے چل کر بالکی میں
 سوار ہو گئی

— (۲) —

کلمتہ کے امیر گھر۔ اور گاؤں کے غریب گھر میں زمین و آسمان کا
 فرق ہوتا ہے۔ لیکن شکنتلا نے کبھی بھی اس بات کا خیال نہ کیا۔ بلکہ گھر
 کے سب کاموں میں ساس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ روشن کے گھر کی غریبی دیکھ
 کر راجکمار نے ایک خادمہ شکنتلا کے ساتھ کر دی۔ لیکن شکنتلا نے گاؤں
 پہنچے ہی اُسے دھپن بیچ دیا۔ اُسے خیال تھا کہ بڑے گھر کی نوکرائی غریب
 گھر کی ہر بات پر ناک بھوں چڑھایا کرے گی۔
 ساس محبت کے مارے ہر وقت خفی کاموں سے شکنتلا کو روکتی
 لیکن شکنتلا خوشی خوشی سب کام کر دیتی تھی۔ بس سے اس نے اپنی ساس

کے دل پر قبضہ کر لیا۔ بہو پر ساس ہی کیا۔ سب گاڈں خوش تھا۔
لیکن اس کا شرا چھانہ نکلا۔ کیونکہ دنیا کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتی۔
اسی سے سب کاموں کا انجام اچھا ہی نہیں نکلتا۔

روشن کے ایک بڑا اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ بڑا بھائی پنجاب میں
نوکری تھا۔ ہر ماہ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر پچاس روپیہ بھیجتا تھا۔ جس سے گھر کا
کام چلتا تھا۔ اور دونوں چھوٹے بھائی پڑھتے تھے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کل گھر کے خرچ کے لئے پچاس روپے
بہت کم ہیں۔ لیکن بڑے بھائی کی بیوی پدماک کے غرور کے لئے اتنے روپے
ہی کافی تھے۔ خاندان سال بھر نوکری میں لگا رہتا تھا۔ اس نے اس کی
بیوی سال بھر رام کرتی تھی۔ وہ کچھ کام کا ج نہ کرتی تھی۔ تب بھی سارا
گنہہ اس کے ذریعہ اٹھاتا تھا۔

شکستہ صاحب کلکتہ سے آکر دن رات گھر کے کام میں رہنے لگی۔ بدماک
کے کید دل میں جلن پیدا ہوئی ماس نے دل میں سوچا کہ بڑے گھر
کی لڑکی چھوٹے چھوٹے کام کر کے مجھے نظروں سے گرا نا چاہتی ہے۔ اُسے
چھوٹی بہو کی عاجزی میں غرور اور بڑاپن نظر آنے لگا۔

روشن نے گاڈں آکر ایک لائبریری قائم کی۔ پندرہ بیس سکول
کے لڑکوں کو جمع کر کے خود صبر بن گیا۔ بڑے بڑے اخباروں میں وہاں

کی خبریں بھیجنے لگا۔ مگر گھر میں ایک پسہ بھی نہ آتا۔ بلکہ خرچ اور بڑھ گیا۔ شکنتلا بار بار اسے ملازمت کرنے کو کہنے لگی۔ مگر اس نے اس پر کان نہ دیئے۔ بیوی سے کہا ”میرے لایق نوکریاں ضرور ہیں۔ لیکن انگریز ان جگہوں پر بڑے بڑے انگریزوں کو ہی ملازم رکھتے ہیں۔“ اصلیت یہ تھی کہ اس نے کبھی ملازمت کی کوشش ہی نہ کی تھی۔

پہ ما۔ اپنے دیور اور دیورانی کو طعنہ زنی کرنے لگی۔ ضرور کے ساتھ اپنی عریسی کا ذکر کر کے کہتی: ”ہم غریب آدمی ہوئے۔ بڑے آدمی کی لڑکی اور داماد کی پرورش کیسے کر سکتے ہیں؟ وہاں تو مرے میں تھے۔ کوئی تکلیف نہ تھی۔ یہاں سوکھی روٹیاں کس طرح کھائی جائیں گی؟“

ساس بڑی بہو سے ڈرتی تھی۔ اس لئے شکنتلا کی طرف سے کچھ بھی نہ بول سکتی تھی۔ اور نہ ہی بولنے کی ہمت ہوتی تھی۔ شکنتلا بھی چپ چاپ سب باتوں کو برداشت کر لے لگی۔

انہیں دنوں روشن کے بڑے بھائی چھٹیوں میں گھر آئے۔ بیوی کی باتوں سے ان کی مینہ حرام ہو گئی۔ آخر ایک دن وہ روشن سے بولنے لگے ”میں ملازمت تلاش کرنی چاہئے۔ میں اکیلا گھر کا بوجھ کس طرح برداشت کر سکتا ہوں؟“ روشن لالچی کھائے ہوئے سانپ کی طرح بیوی سانپ لے کر اپنے دل میں سوچنے لگا۔ دودھ۔ سوکھی روٹی کھلا کر بیوی کو طعنہ زنی کرنا

اور بھائی کا ملازمت کرنے کے لئے کہنا۔۔۔۔۔ وہ اسی وقت بیوی کو ساتھ لے کر سسرال جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

لیکن شکنتلا وہاں جانے کے لئے رضا مند نہ ہوتی۔ اس نے رائے ظاہر کی کہ بڑے بھائی کی روٹی اور بھادرج کی گالیاں کھانا چھوٹے بھائی کا خاندانی حق ہے۔ مگر سسرال میں جا کر رہنا بہت شرمندگی کی بات ہے۔ کیونکہ اس پر کوئی دعوے نہیں ہے۔ شکنتلا سسرال میں ہر طرح کے ظلم برداشت کر کے بھی رہ سکتی ہے۔ مگر باپ کے اپنی عزت بنائے رکھ کر سسرال چاکر رہنا نہیں چاہتی۔

اُسی وقت گاؤں کے ہائی سکول میں تھریڈ ماسٹر کی جگہ خالی ہوئی روشن کے بھائی اور شکنتلا نے کئی دفعہ وہاں نوکری کرنے کو کہا۔ مگر اس کا نتیجہ بھی اُلٹا ہی نکلا۔ اپنے حقیقی بھائی اور بیوی کو ایسی چھوٹی ملازمت کرنے کے لئے مجبور کرتے ہوئے دیکھ کر وہ بہت ناراض ہوئے۔

تب بڑے بھائی نے بہت سی میٹھی باتوں سے خاموش کیا۔ سب نے اپنے دل میں کہا۔ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ روشن گھر میں ہی رہے۔ کہیں ناراض ہو کر چلا نہ جائے۔ یہی غنیمت ہے۔

چھٹی ختم ہونے پر بڑے بھائی نوکری پر چلے گئے۔ پدما کچھ دن تک منہ پھیلائے پھرتی رہی۔ روشن نے شکنتلا سے کہا: ”آج کل ولایت

گئے بغیر کوئی اچھی نوکری نہیں مل سکتی۔ میں ولایت جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم اپنے باپ سے کچھ روپیہ مانگو۔“

ایک تو ولایت جانے کی بات سُن کر ہی شکنتلا کا کلیجہ دھک سے میٹھ گیا۔ اور اس کے علاوہ باپ سے روپیہ مانگنے کی بات سُن کر وہ نوچے شرم سے مری گئی۔

وہ باپ کے ہاں نہ گئی۔ اور نہ ہی روپیہ کے لئے کوئی دوسرا طریقہ کیا۔ اس سے روشن اپنی بومی سے خوب اُٹھے یہاں تک کہ لونہا بھی بند کر دیا۔ روتے روتے شکنتلا کی آنکھیں پھول گئیں۔ اسی طرح کئی دن گزرے۔

آخر دُرکا پوچا کہ دن نزدیک آئے۔ دُرکا پوچا بنگالیوں کا ایک بڑا بھاری ہتھوڑ ہے۔ لڑکی اور داماد کو بٹانے کے لئے راجکمار نے بہت سا سامان اور آدھی بھیجے۔ سال بھر بعد لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ اپنے والد کے گھر آئی۔ اس دفعہ داماد کی پہلے کی نسبت بہت خاطر ہوئی شکنتلا بھی خوش تھی۔

اس دن چٹھہ تھی۔ کل ساتویں ہوگی۔ دُھوم دھام۔ شور و غل کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ دُور اور نزدیکی رشتہ داروں سے بابور راجکمار کا گھر بھر گیا۔

رات کو کام کاج سے تھکی ہوئی شکنتلا جلدی ہی سو گئی۔ پہلے جس کمرہ میں شکنتلا رہتی تھی۔ یہ وہ کمرہ نہ تھا۔ اب کے زیادہ عزت دکھانے کے لئے۔ اجمکمار نے اپنا خاص کمرہ شکنتلا کو رہنے کے لئے دیا تھا۔ روشن کب سونے کے لئے کمرہ میں آیا۔ اس کا شکنتلا کو کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ گہری نیند میں خائے رہی تھی۔

سورج نکلنے سے پہلے ہی شور و غل ہونے لگا۔ مگر تھکی ہوئی شکنتلا کو کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ وہ مزے میں سو رہی تھی۔ کد اور موہنی دودھیلیاں چھپ کر بوسی خاوند کی باتیں سننے کے لئے شکنتلا کے بند دروازہ کے باہر کان لگاے کھڑی تھیں مگر کوئی آواز نہ سن کر دونوں گلکھلا کر ہنس پڑیں اور اس آہنی کی آواز سے شکنتلا کی نیند ٹوٹ گئی۔ روشن کب اس کے پاس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اس کا بھی اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ غر مند ہو گئی آخر پلنگ سے نیچے قدم رکھتے ہی اس کی نظر اپنی ماں کے لوہے کے صندوق پر پڑی۔ صندوق کھلا تھا۔ اس کے اندر اجمکمار بالو کا کیش بکس رہتا تھا اور اب وہ کم تھا۔

تب اُسے یاد آیا کہ کل ماں کی چابیوں کا گچھا کم ہو جانے سے بُری کھلبلی مچی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ انہیں چابیوں سے ہی کسی نے یہ چوری کی ہے۔ پھر اسے خیال کہ چوروں نے کہیں اس کے

خاوند کو کوئی ضرب نہ پہنچائی ہو۔ دل دہرکنے لگا۔ پلنگ کے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ ماں کی چابیوں کے گچھے کے نیچے ایک خط پڑا ہے۔ یہ خط اُسی کے خاوند کا تھا۔ لکھا تھا کہ میں نے کسی دہست کی مدد سے ولایت کا ٹکٹ خرید لیا ہے۔ اب وہاں کے اخراجات کے لئے کوئی انتظام نہ دیکھ کر سسر کا روپیہ چوری کیا ہے۔ جہاز آج صبح ہی روانہ ہوگا۔

خط پڑھ کر شکنتلا کا جسم کانپ اُٹھا۔ تمام خون ٹھنڈا ہو گیا۔ چاہی پانی کا پایہ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت تمام بنگال میں لوگ خوشیوں میں مست تھے۔

گھر بھر میں شور و غل مچ گیا۔ سب خوش تھے۔ اتنا دن گزر جانے پر بھی جب شکنتلا کا کمرہ نہ کھلا۔ تب کھلا اور موہنی ہنستے ہنستے اس کے کوارٹر تھپتھپانے لگیں۔ تب بھی کچھ جواب نہ پا کر وہ شکنتلا کا نام لے کر پکارنے لگیں۔

شکنتلا نے بھری آواز میں کہا ”آتی ہوں۔ تم چلو“

دونوں سہیلیاں اس کی طبیعت خراب ہونے کے شبہ میں اس کی والدہ کو بلالائیں۔ ماں نے آکر کہا ”بیٹی! کیسی طبیعت ہے۔ ابھی تک دو۔ وازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟“

شکنتلا نے روتے ہوئے کہا۔ ”ذرا بابو جی کو بلاؤ۔“
 اماں بہت ڈریں۔ اسی وقت اپنے خاند کو بلا لائیں۔ شکنتلا
 جلد ہی سے دروازہ کھول کر ماں اور باپ کو اندر لے گئی۔ اور اندر سے
 دروازہ بند کر دیا۔

تب شکنتلا زمین پر لوٹ کر اور اپنے باپ کے پاؤں پکڑ کر
 پھوٹ پھوٹ کر رو کر کہنے لگی۔ ”بابو جی۔ مجھے معاف کریں۔ میں نے
 تمہارے صندوق سے روپے نکال لئے ہیں۔“
 ماں اور باپ سناٹے میں اکر بیٹنگ پر بیٹھ گئے۔
 شکنتلا نے کہا ”اپنے خاند کو ولایت بھیجنے کے لئے میں نے یہ
 کام کیا ہے۔“

باپ نے پوچھا۔ ”تم نے ہم سے کیوں نہ مانگے؟“
 آپ ولایت جانے میں روک ٹوک نہ کریں۔ اسی لئے میں نے
 ایسا کیا ہے۔“

راجہ کار دل میں بہت ناراض ہوئے۔ ماں بیٹی رونے لگیں۔
 کلکتے میں چاروں طرف خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔

جو شکنتلا باپ سے روپیہ نہ مانگ سکی۔ اور جو اپنے خاند کی اس
 چوری کے الزام کو اپنے ماں باپ سے چھپا سکتی ہو۔ اس کی عزت۔ آبرو

خاک میں بل گئی۔ اس کا غرور سب کے پاؤں تلے چٹکا جانے لگا۔ پہلے ہی سے مشورہ کر کے اور چابیاں چوری کر کے غار و ند اپنی بیوی کی مدد سے لپیٹ چٹا کر ولایت چلا گیا ہے۔ اس بات کا ذکر ہر رشتہ دار کی زبان پر تھا۔ بند دروازہ کے باہر کھڑے ہو کر کھلا۔ موہنی۔ رشتہ داروں اور سب نوکروں سے باتیں سن لی تھیں۔ لڑکی کے کمرہ سے گھبرہٹ میں ماں باپ کو جاتے دیکھ کر سب لوگ کمرہ میں جمع ہو گئے۔ مگر شکنتلا نے کسی سے بات نہ کی اور اسی کمرہ میں بغیر کھائے پڑی رہی۔ اس کے اس طریقہ سے کسی کو کچھ تکلیف یا فکر نہ ہوا۔ تہوار ختم ہو گیا۔

— (۲۳) —

بچے عزت ہو کر شکنتلا اپنے سسرال آئی۔ وہاں جوہ ساس اور شکنتلا۔ مصیبت زدہ شکنتلا کی آپس میں اور بھی بن آئی۔ دونوں میں محبت بڑھ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی تکلیفوں کا اندازہ کر کے دل ہی دل میں جلنے لگیں۔ اب دونوں گھر کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے لگیں۔ شکنتلا سوچتی۔ ساس جتنا نزدیک آئی دلین انہا ہی دور ہو گئے۔

دو دن باؤ پہلے تو ولایت پہنچ کر برابر شکنتلا کو خط لکھتے رہے۔ لیکن بعد میں خط آنے لگے۔ اور جو آتے بھی ان سے نفرت ہوتی روشن جیسے لاپتہ

آدمی اگر گھر کے کام کاج میں لگی رہنے والی عورت کو نفرت سے دیکھنے لگیں۔
تو کوئی نئی بات نہیں۔

لیکن جب روپیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو اس بنگالی لڑکے
کو اپنی بیوی کو تار دینے میں ذرا بھی شرم نہ آئی۔ اور اس بنگالی عورت
نے اپنی ہاتھ کی پوڑیوں کو چھوڑ کر سب زبورات فروخت کر کے
اپنے خاوند کو روپیہ بھیج دیا۔ اور اپنے خط کے ہر لفظ کو اپنے آنسوؤں
سے بھگا بھگا کر خاوند کو واپس گھر آ جانے کو لکھا۔

روشن بابو انگریزی فیشن میں ملبوس بیرسٹری پاس کر کے گھر لوٹ
آئے۔ اگر وہ کلکتہ کے ایک ہوٹل میں مہرے۔ باپ کے گھر رہنا ناممکن
تھا۔ کیونکہ ایک تو بیرسٹر صاحب کے لائن وہاں کوئی جگہ نہ تھی۔ دوسرے
گاؤں کے لوگ اُسے برادری سے الگ رکھیں گے۔ روشن کے سرسہ بھی
پہنانے خیالات کے تھے۔ وہ بھی اُسے اپنے گھر نہ رکھ سکتے تھے۔

روپیہ کی کمی کے سبب سے روشن ہوٹل چھوڑ کر ایک کرایہ کے
مکان میں رہنے لگا۔ اس گھر میں اپنی بیوی کو لانا نہ چاہتے تھے۔ ولایت
سے آنے پر صرف ایک گھنٹہ کے لئے ماں اور بیوی کو ملنے وہ گاؤں گئے
تھے۔ اُس کے بعد پھر کبھی ملاقات نہ کی۔

دونوں عورتیں اسی بھروسہ پر خوش تھیں۔ کہ روشن اپنے دلش

میں واپس آگیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے بیرسٹرن کرائے سے وہ بہت ہی خوش تھیں۔ ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ شکنتلا اپنے کو اپنے خاوند کے قابل نہ ہونے پر اپنے آپ کو دھتکارنے لگی۔

جب روشن اپنے گھر کا خرچ بھی نہ چلا سکے۔ تب اس نے یہ سوچا۔ کہ ہندوستان میں لیاقت کی قدر نہیں ہے۔ اور ان کے ہم پیشہ لوگ ان کی عزت کو دیکھ کر حد کے مارے ان کی عزت میں روکاوٹ ڈالتے ہیں۔ جب ان کی میز پر انڈوں کی جگہ بھری نے لے لی۔ اور بٹھنے ہوئے مڑھے کی بجائے مچھلی ملنے لگی۔ اور ٹھاٹ باٹ پھیکا پڑنے لگا۔ تب اسی وقت راجکمار بابو کے ہاں دردناک واقعہ ہوا۔ جس سے روشن نے ادھر نہ کیا۔ راجکمار بابو کا لڑکا اپنی بیوی کو لے کر گھر واپس آ رہا تھا۔ اچانک کشتی اُلٹ جانے سے میاں بیوی کی موت ہو گئی۔ اب ان کی دولت کی واحد مالکہ شکنتلا تھی۔

کچھ دنوں بعد جب راجکمار اس صدمہ کو برداشت کر چکے۔ تو ایک دن وہ روشن کے ہاں گئے۔ اور بولے ”بیٹا۔ اب تم کو براہمنوں کو کھانا دیکر برا درسی میں ملنا چاہئے۔ کیونکہ میرا مہتا رے بغیر کوئی نہیں ہے۔“ روشن جلد ہی رونا مند ہو گیا۔ اُس نے سوچا جو لوگ پوگروم اور لائبریریوں میں شیعہ کرائے سے حد کرتے تھے۔ اُن سے اس طرح بدلہ کھانا ہوگا۔

راجکمار نے پنڈتوں کو لکھا۔ انہوں نے جواب دیا۔ روشن نے اگر ولایت میں گوشت نہ کھایا ہو۔ تو برادری میں کھانا دیکر برادری میں شامل ہو سکتے ہیں۔

ولایت میں گوہر چیز میں گوشت شامل تھا۔ تو بھی اس بات میں انکار کرنے میں روشن کو ذرا بھی ڈر معلوم نہ ہوا۔ اپنے دوستوں سے کہنے لگے ”سماج جب اپنی خواہش سے مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کر رہی ہے تب ایک ذرا اسی بات کہہ کر اس مصیبت سے چھٹکارا پانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جس زبان سے گوشت کھایا ہو۔ اُسے گوہر اور جھوٹ بولے ہوئے و دھوکوں سے پاک کر لینا ہمارے سماج کا ایک اصول ہے۔ یہیں اس اصول کے خلاف جانا نہیں چاہتا۔

برادری میں ملنے کے لئے ایک دن مقرر ہو گیا۔ اسی درمیان میں روشن نے صرف دھوتی ہی نہیں پہنی۔ بلکہ سبٹ کے ساتھ ولایتی اشیاء پر سیاہی اور برادری اور سماج کے منہ پر سفیدی بھی پھیرنے لگے جس نے سنا وہی خوش ہوا۔

خوشی سے شکستا آپسے سے باہر ہو گئی۔ اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اس نے کہا ”ولایت سے جو آتا ہے۔ وہ صاحب بن کر آتا ہے۔ لیکن میرے خاوند اپنے پُرانے خیالات میں ہی لوٹے۔ وہ ہندو دھرم کی پہلے سے

بھی زیادہ عزت کرتے ہیں۔“

مقررہ دن براہمنوں۔ پنڈتوں سے راجکمار بابو کا گھر بھر گیا۔
ان کے کھانے اور دان کا خوب خیال رکھا گیا تھا۔

گھر کے اندر زنا نچانہ میں بھی خوب دھوم تھی۔ رشتہ داروں۔
پڑوسیوں کے کھانے کا بہت اعلیٰ انتظام تھا۔ اس بھیڑ بھڑکے میں شکنتلا
ایکادشی کے چاند کی طرح خوشی خوشی ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ آج کے دن
دُنیا کا بیرو اس کا فائدہ تھا۔ بدشن بابو۔ جیسے آج ولایت سے واپس
آکر ہندو دھرم میں شامل ہو کر اُس کی شان دو بالا کر رہے ہیں۔ اور
اُسی شان کے چھینٹے ساری دُنیا سے آکر شکنتلا پر پڑ رہے ہیں۔ اتنے
دُفوں کی تکلیف اور بے عزتی آج کا فور ہو گئی۔ وہ آج خوش تھی اس کا
سر بھر سے والدین کے گھر میں اُدبجا تھا۔ اس کے خاوند نے اپنے
گُٹ ہوں کا کفارہ کر لیا۔ اسی سے شکنتلا پھو سے نہ سماقی
تھی۔

کفارہ کے بعد روشن بابو سماج میں مل گئے۔ دوستوں۔
مشتہ داروں اور براہمنوں نے روشن کے ساتھ بیٹھ کر آج پھر
کھانا کھایا

شیرال کی عورتوں نے داماد کو دیکھنے کے لئے زنا نچانہ میں بلایا۔

سوغن مزے میں پان چباتے چباتے ہوتے زمین تک نکلتی ہوئی
چادر اوٹھے اندر داخل ہوئے ۔

کھانے کے بعد براہمن لوگوں کے دان دینے کا انتظام ہو رہا تھا اور براہمن لوگ برادری میں بیٹھے اپنا اپنا راک ہانک رہے تھے۔ جوڑے راجکمار بابو ذرا آرام کرنے کے خیال سے اُسی برادری میں بیٹھے۔ اُن کی بحث سُن رہے تھے۔ اُسی وقت دربان نے اکرام کے ہاتھ میں ایک مُلقاتی کارڈ دیا اور کہا ”ایک میم صاحبہ آئی ہیں۔“

راجہ کا رچونک پڑے۔ کارڈ دیکھا۔ اس میں انگریزی

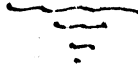
میں لکھا تھا ”مسٹر روشن بابو۔۔۔ یعنی روشن بابو سرکار کی بیوی۔“

راجکمار بابو بہت دیر تک چرائی سے اس کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اسی وقت ولایت آئی ہوئی۔ لال لال رُخساروں والی، سنہرے بالوں والی۔ ہرن کی سی بڑی بڑی آنکھوں والی۔ دودھ کی طرح سفید رنگ والی۔ منوالی چال چلتی ہوئی۔ ایک انگریز دوشیزہ اس جگہ آپہنچی۔ اور ہر ایک کو غور سے دیکھنے لگی۔ لیکن وہ اپنے بچہ جانے چہرہ کو نہ دیکھ سکی۔ اچانک ہی اس میم کو دیکھ کر سب کا بحث مباحثہ بند ہو گیا۔ برادری میں ایک سناٹا مچا گیا۔

عین اسی وقت روشن ہاؤ چادر سے زمین صا کرتے ہوئے وہاں

آپہنچے۔ اسی دم وہ انگریز لڑکی دوڑ کر اُن سے لپٹ گئی۔ اور اُن کے
ہونٹوں سے اپنے ہونٹ لگائے۔

اُس دن کے بعد برادری میں پھر کوئی بحث و مباحثہ نہ ہوا۔
مگر شکستہ یاس کی آگ میں شب و روز جلنے لگی۔



شعاع
شمس

افسانه نمبر ۱۱

پھول

اِس جھوٹے سے خوبصورت پھول کو توڑ لے۔ اور لے لے۔ دیر نہ کر! مجھے خوف ہے۔ کہ کہیں یہ مرجھا کر خاک پر نہ گر پڑے۔

تیرے ہار میں چاہے اُسے جگہ نہ ملے۔ مگر اپنے پاؤں سے چھو کر اُس کی عزت کو بڑھا دے۔ اور توڑ لے۔ مجھے ڈر ہے۔ کہ کہیں میرے آگاہ ہونے سے پشتِ تیر ہی نذر کا وقت ختم نہ ہو جائے

بیشک اِس کا رنگ گہرا نہیں۔ اور اُس کی خوشبو بھی خاص تیز نہیں مگر پھر بھی اپنی بوجھ کے لئے اِس پھول کو استعمال کر۔ ابھی وقت ہے۔ اسے توڑ لے

شعلہ تبسم

نہیندہ کی غم کو کم تھی۔ مگر پھر بھی اُس نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہ کی۔ اس صدمہ کو نبھانے اور اپنا دل پہلانے کے لئے شکار کرنے لگا۔ اس کا جسم سڈول تھا۔ نیز نگاہ بھٹی۔ کبھی نشانہ خطانہ ہوا تھا۔ تھا تو نیگالی۔ مگر لباس پنجابیوں کا سا ہی پہنتا تھا۔ اس کے ساتھ پہلوان ہر نام سنگہ بلونت رائے اور گانے بجانے والوں اور بیکار لوگوں کا جگھٹا لگا... رہتا تھا۔

جولائی کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت سے ہر انسان بیزار تھا انہیں دنوں نہیندہ کا دوست سٹریپر کاش ان کے ہاں تفریح کے لئے آجود ہوا

دو چار دونوں بعد وہ دونوں چند مصاحبوں کے ساتھ شکار کے لئے نکلے۔
 دو کشتیوں میں ان کی رہائش کا انتظام تھا۔ نوکروں اور مصاحبوں کیلئے
 بھی تین کشتیاں تھیں۔ شام کے وقت ایک چھوٹے سے گاؤں کے
 کنارے کشتیاں روک لی گئیں۔ بادریجوں کو کھانا تیار کرنے کا حکم ہوا۔
 صبح کا وقت تھا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر شکار کے لئے بند قوس
 صاف کی جانے لگیں۔ دن بھر خوب شکار کیا۔ رات کو کھانے کے بعد
 گانا بجانا شروع ہوا۔ یہ سب لوگ ٹوعلیش میں مست تھے۔ مگر اُس
 گاؤں کی عورتوں کا پانی بھرنا اور نہانا تقریباً بند ہو گیا۔ لوگوں کی نیند
 حرام ہو رہی تھی۔

ایک دن صبح زیند را اپنی کشتی میں بیٹھے اپنے ہاتھ سے دونالی
 بندوق دُرست کر رہے تھے۔ اسی وقت پاس ایک بطخ کی آواز سن کر
 آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ ایک لڑکی دو لٹوں کو چھاتی سے لگانے ہوئے کنارے
 پر کھڑی تھی۔ مدی چونکہ چھوٹی تھی اس لئے یہاں کچھ تیز نہ تھا۔ اور جگہ جگہ
 کئی قسم کے گھاس پیدا ہو گئے تھے۔ بطخیں کہیں دُور نہ پہنچ سکتیں۔ لڑکی
 انہیں ہاتھ کے سہارے پکڑے ہوئے پانی میں تیرا رہی تھی۔

لڑکی کی عمر کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے۔ مگر جوانی چھوٹ چھوٹ کر نکل
 رہی تھی۔ چہرہ خوبصورت تھا۔ اور آنکھیں شرم و حیا سے پُر تھیں۔ وہ اتنی سیدھی

تھی کہ اُسے معلوم تک نہ تھا۔ کہ وہ اب جوان ہے وہ اپنی لڑکپن کی
اداؤں میں ہی مست تھی۔ بالکل مدہوش۔

کچھ عرصہ کے لئے تو نرینہ راپنی بندوق صاف کرنا بھول گئی یہاں
تک کہ اپنے کو بھول گئی۔ ایسا حسین چہرہ ایسے چھوٹے سے گاؤں میں
دیکھنے کو ملے گا۔ اس کا اُسے خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ مگر کسی راج کی جگہ
یہ دلربا چہرہ اسی کنارے پر اچھا معلوم ہوتا تھا۔ بھول سجائے اس کے کہ
سولنے کے بھولدان میں رکھا جائے۔ پودوں میں ہی خوبصورت معلوم
بڑتا ہے۔ اس دن بادل گھر سے ہوئے تھے۔ ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی۔
جس سے اُس لڑکی کی اوڑھنی سر سے گری جاتی تھی۔ کنارے کا نظارہ
قابلہ دید تھا۔ اور اس پر ایک بھولا چہرہ دیکھ کر نرینہ رحیران سا ہو گیا۔
یہ ایک وہ لڑکی ڈر کر اپنی لٹخوں کو بغل میں دبا کر اُٹھتی۔ نامعلوم
کیا بڑ بڑاتی ہوئی کنارے سے چل دی۔ یہ دیکھ کر نرینہ راس کے اس طرح
بھاگنے کا سبب معلوم کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دیکھا کہ تیسری
کشتی پر ایک مصاحب اپنی بندوق کو اس لڑکی کی طرف کر کے اس کو
ڈرا رہا ہے۔ نرینہ نے پیچھے جا کر بندوق چھین لی۔ اور اُسے ایک تھپڑ
رسید کیا۔ اچانک رنگ میں بھنگ دیکھ کر وہ مصاحب اندر چلا گیا۔ نرینہ
پھر اپنی کشتی پر آیا اور بندوق دُرت کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد نریندر نے ایک کبوتر کو گولی ماری۔ جو کچھ دُور جا کر گرا۔
 شکار کی تلاش میں اس چھوٹے سے گاؤں میں گیا۔ مگر اُسے زیادہ حیران
 نہ ہونا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ ایک گھر کے باہر بڑے درخت کے نیچے
 وہی لڑکی اس زخمی کبوتر کو گود میں لئے روئی کے پھاہا سے پانی پلا رہی
 ہے۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ اس کی پالتو بلی بھی کبوتر کو دیکھ کر
 اس کا شکار کرنا چاہتی ہے۔ مگر لڑکی کے دُور سے اتنا توصلہ نہیں کرتی۔
 کہ اس کی گود سے کبوتر کو چھٹ لے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دُھوپ اور چھایا اس پیڑ کی گھنی شاخوں سے
 چھن چھن کر اس لڑکی پر پڑ رہی تھیں۔ پاس ایک گائے بیٹھی جگالی کر رہی
 تھی اور یہ لڑکی جو صبح ندی کے کنارے ایک جنگل کی رانی معلوم دیتی تھی۔
 مگر اسی وقت وہ ایک گھریلو دیوی سی دیکھ پڑتی تھی۔ نریندر ہاتھ میں
 بندوق لئے اس کے سامنے آیا۔ وہ بہت شرمندہ تھا، اولاً سوچ رہا
 تھا کہ یہ کس طرح ثابت کیا جائے۔ کہ کبوتر اس کی گولی سے زخمی نہیں
 ہوا۔ وہ ابھی یہ سوچ رہا تھا۔ کہ گھر کے اندر سے کسی نے پکارا۔ نرملہ!
 لڑکی چونک اُٹھی۔ پھر کسی نے پکارا۔ نرملہ۔ تب وہ جلدی سے اُٹھی۔
 کبوتر کے ساتھ گھر کے اندر چلی گئی۔ نریندر نے اپنے دل میں کہا۔۔۔
 نام تو بہت ٹھیک ہے۔۔۔ نرملہ!

نریند کشتی پر پہنچا۔ بدوق رکھ کر بھرائی گھر کے در پر چلا گیا۔ دیکھا
ایک چوترے پر بیٹھا ایک براہمن سر منڈوائے مالا جپ رہا ہے۔
اس کے چہرہ سے ایسور بھگتی ٹپک رہی تھی۔ نریندر نے براہمن کو منسکاً
کر کے کہا ”پیس لگی ہے ہمارا ج! ایک لوٹا پانی کامل سکتا ہے؟ براہمن
نے عزت سے ایک بگہ بھلایا۔ اور پھر اٹھ کر اندر گیا۔ اور ایک لوٹا
پانی اور کچھ پتاشے لے کر باہر آیا۔ اور نریندر کے سامنے رکھ دیا۔
نریندر کے پانی پی چکنے کے بعد براہمن نے اس کا نام پوچھا۔ نریند
نے اپنا نام بتلا کر کہا ”ہمارا ج! اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو۔ تو بلا تامل
مجھ سے کہنے گا۔“

اُس براہمن کا نام کانشی رام جوشی تھا۔ اُس نے کہا ”بیٹا! تم میری
کیا خدمت کر سکو گے؟ نرملانا نام کی میری ایک لڑکی ہے۔ اس کی کسی اچھے
لڑکے سے شادی کر کے میں اس کام سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔۔۔
نزدیکی گاؤں میں تو کوئی اچھے خاندان کا شریف لڑکا ملتا نہیں۔ اور دُور
جانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ گھر میں بھگو ان کرشن کی مورتی ہے۔
اُسے چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا۔“

”اگر آپ میری کشتی پر چلیں۔ تو ایک خاندانی لڑکا بتلا سکتے ہوں۔“

ادھر نریندر نے کشتی پر آتے ہی اپنے آدمیوں کو گاؤں میں بھیجا۔ تاکہ وہ نرملہ کے چال چلن کے متعلق کچھ دریا فنت کر سکیں۔ گاؤں میں جس سے بھی نرملہ کا ذکر آیا۔ سب نے اس کی خوبیاں بیاں کیں۔ دوسرے دن کانٹی رام جب کشتی پر آیا۔ تو نریندر نے اسے بڑی عزت سے اپنی بغلی کی کرسی پر بٹھلایا۔ ادا باتوں ہی باتوں میں ظاہر کر دیا۔ کہ وہ خود ہی اس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کانٹی رام یہ سن کر پہلے تو اچنبھے میں آگیا۔ پھر خیالی کیا۔ کہ شاید نریندر کو نرملہ کے متعلق کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اُس نے حیرانی سے پوچھا ”تم میری لڑکی سے شادی کر دگے؟“

نریندر نے جواب دیا۔ ”اگر آپ کو کچھ اعتراض نہ ہو۔ تو میں تیار ہوں۔“

کانٹی نے پھر پوچھا ”نرملہ کے ساتھ؟“

”جی ہاں۔“

”کانٹی رام نے سنجیدگی سے کہا ”تم نے ابھی اسے دیکھا بھی ہے

یا نہیں؟“

جیسے نرملہ کو ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ ایسا سنہ بنا کر کہا ”آپ اس کا کوئی فکر نہ کریں۔“

کانشی رام خوش ہو کر بولا ”میری نرملہ بہت ہی نیک لڑکی ہے۔ گھر کے کام کاج سے اچھی طرح واقف ہے۔ تم جیسے بغیر اسے دیکھ ہی شادی کے لئے تیار ہو۔ میں بھی دُعا کرتا ہوں کہ میری نرملہ ہمیشہ تمہارے حکم کے مطابق چلے۔“

آئندہ جنوری میں شادی ہونا مقرر ہو گیا۔ گاؤں کے زمیندار بابو کلیان چند کے پُرائے گھر میں شادی کا انتظام کیا گیا۔ وقت پر نرملہ باجے گا جے کے ساتھ آگیا۔

شادی کے وقت مانگ میں سُدھور لگانے کی رسم کے وقت نرملہ نے نرملہ کی طرف دیکھا۔ مگر سر جھکائے شرم و حیا کی پتلی نرملہ کا چہرہ نرملہ نہ دیکھ سکا۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھیں چند عیب سی گئیں۔

خاندانی رسم کے مطابق نرملہ نے نرملہ کو کھانا کھلانے کے لئے کہا۔ وہاں بیٹھی ہوئی عورتوں نے زبردستی اُس سے نرملہ کا کھوٹا ٹکڑا کھا دیا۔ کھوٹا ٹکڑا اُٹھتے ہی نرملہ چوٹک اُٹھا۔

یہ تو وہ لڑکی نہیں ہے۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ لڑکی بھی اس کے خیالات کو بھانپ گئی۔ نرملہ نے پہلی عورت کے مرنے کے بعد شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ تمت نے اس کی قسم کو اس طرح

کی دل لگی کر کے چٹکی بھر میں برباد کر دیا۔ کتنے ہی خاندانی رشتے آئے۔ مگر نریندر نے سب نامنظور کر دیئے۔ بڑے گھرنے کا خیال۔ دولت کا لالچ نریندر کو اس کی قسم سے نہ گرا سکا۔ لیکن آخر ایک لنگال براہمن کی لڑکی سے شادی کر کے وہ دنیا کو کیا منہ دکھلائے گا۔ پہلے سسر کے اوپر غصہ آیا۔ کہ بد معاش نے دوسری لڑکی دکھلا کر مجھے بھانسن لیا۔ لیکن پھر سوچا کہ اس نے تو لڑکی نہیں دکھلائی۔ بلکہ وہ تو لڑکی دیکھنے پر زور دے رہا تھا۔ مگر میں نے ہی نہ کر دی تھی۔ اپنی غلطی کو کسی پر نہ ظاہر کرنا ہی ٹھیک سمجھ کر وہ چپ رہا۔

وہ کڑوی دوائی کی طرح اس بات کو پی گئے۔ مگر ان کا چہرہ یہ راز چھپانہ سکا۔ سسرال کی عورتوں کی مہنسی مذاق اسے بڑا معلوم ہونے لگا۔ اپنے اوپر وہ بہت رنجیدہ تھا۔ اسی وقت نریندر کے پاس بیٹھی ہوئی بہو چونک اُٹھی۔ اچانک ہی اس کے پاس سے ایک خرگوش نکل بھاگا۔ اسی دم اس دن والی لڑکی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی۔ خرگوش کو پکڑ کر اس کے رُخسار پر رخسار رکھ کر اُسے پیار کرنے لگی۔ ”وہ بچی آگئی“ کہہ کر سب عورتیں اُسے اشارہ سے چلے جانے کو کہنے لگیں۔ لیکن وہ ادھر دھیان نہ دے کر بہو کے پاس بیٹھ کر بڑی حیرانی سے دیکھنے لگی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ایک عورت نے اُسے زبردستی پکڑ کر وہاں سے

بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ نریندر نے کہا: ”اُسے بیٹھی رہنے دو،“ اس کے بعد نریندر نے لڑکی سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“
 کچھ جواب نہ دے کر وہ لڑکی نریندر کی طرف دیکھنے لگی۔ سب عورتیں
 کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ نریندر نے پھر کہا ”تمہاری بطنیں تو اچھی ہیں؟“
 وہ لڑکی بغیر کوئی جواب دیئے۔ نریندر کے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی۔
 نریندر نے حوصلہ کر کے پوچھا۔ ”تمہارا وہ کبوتر اچھا ہو گیا؟“ مگر پھر
 بھی کچھ جواب نہ ملا۔ سب عورتیں اس طرح ہنسنے لگیں۔ جیسے دو لہا کو سخت
 دھوکا ہوا ہو۔

آخر کار نریندر کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ لڑکی بہری اور گونگئی ہے۔
 گاؤں کے سب چرنڈ پرند ہی اُس کے ساتھی ہیں۔ اس دن نرملاکا پکار
 سُن کر وہ اندر چلی گئی تھی تو وہ اس کا اندازہ ہی تھا۔ یہ سُن کر نریندر چونک
 پڑا۔ جس کو نہ پا کر وہ اتنا اُداس اور فکر مند تھا۔ تقدیر نے اسی کے ہاتھ
 سے چھپکا سا پاکرا اپنے کو خوش نصیب سمجھنے لگا۔ نریندر دل میں سوچنے
 لگا کہ اگر میں اسی لڑکی کے باپ سے ملتا۔ اور میری خواہش کے مطابق
 اس لڑکی کی شادی میرے ساتھ کر دیتا تو! جب تک نریندر کے دل میں
 اس لڑکی کا خیال رہا۔ تب تک وہ اپنی عورت کی طرف سے لاپرواہا
 تھا۔ مگر جب اس لڑکی کو گونگا اور بہرہ پایا۔ تب تو ان کی آنکھوں سے

سیاہ پردہ الگ ہو گیا۔ نہیندر نے ایشور کا شکریہ ادا کیا۔ اور موقعہ پا کر اپنی عورت کی دیکھا۔ اس کو اپنی نئی عورت لکشمی سے بڑھ کر خوبصورت معلوم ہونے لگی۔ اتنی دیر کے بعد انہوں نے سمجھا کہ کانشی رام کی دعا رائیگاں نہ جائے گی۔ کیونکہ اب اُن کا شعلہ دل اپنی بیوی کے نورِ فشاں چہرے سے سرد ہو چکا تھا۔ اور ”شعلہ تبسم“ سے منور۔

شعله الغرض

افسانه نمبر ۲

نذرِ نغمہ

میں زندگی بھر اپنے نغموں کے ذریعہ تجھے تلاش کرتا رہا ہوں۔
یہ گیت ہی مجھے درد پہرتے ہیں۔ میں نے اپنے اور دنیا کے بارے میں
جو تجربہ حاصل کیا ہے۔ اُس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ تو ہر جگہ ہے۔ یہ
نتیجہ صرف اُن نغموں کی بدولت ہے۔

میں نے جو کچھ سیکھا ہے۔ وہ بھی انہیں کی وجہ سے۔ انہوں
نے مجھے پوشیدہ راستہ بتایا ہے۔ انہی گیتوں سے آسمانِ دل پر سنکڑوں
ستارے جگمگا رہے ہیں۔

جو ہمیشہ مجھے راستہ دکھاتے رہے اور غم و رنج کے راز آشکار
کرتے رہے۔ اور اس آخری وقت میں جیکے شاہ کا اندھیرا بڑھ رہا ہے۔
کسی شاہی محل کے دروازے پر مجھے لاکھڑا کیا ہے۔

شعلہٴ بغض

موسمِ سرما عینِ شباب پر تھا۔ پورنماشی کا چاند اپنی پوری طاقت سے روشن تھا۔ حسینانِ جہاں چاند کو دیکھ کر مارے شرم کے آبِ آب ہو ہو رہے تھے۔ موسمِ بہار کی وجہ سے پھولوں کا بازار گرم تھا۔ جس طرف بھی آنکھ جاتی تھی۔ گلؤں میں چھپ کر اپنے آپ کو کھو جاتی تھی۔ ہوا گلؤں کو سبوں سے لگا کر ان سے پریم کر خوشبو کو پھرتی تھی۔ اور پھر لوگوں کو سونگھا سونگھا کر دُنیادما فیہا سے بے خبر کر رہی تھی۔ چکوسی اپنے پیاسے چکویں کے دیوگ میں پانی کے کنارے بیٹھ کر اس طرز سے نالہ کر رہی تھی کہ اس کی درد بھری صدا نوجوانوں کے دلوں میں بھی فراق کی آگ

پیدا کر رہی تھی۔ اور ماہی بے آب کی طرح نرم نرم گدلیوں سے باہر ترپا رہی تھی۔

شیام اپنے نرم نرم ہاتھوں سے کالے کالے گیسوؤں کو جوٹ پیدکسے چاند جیسے بے داغ چہرے کو گھیرے ہوئے تھے۔ ہناتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی پیار سی پیار سی چوڑیوں کو اس کے نازک بدن کو پے درپے بوسہ بوسہ دیتا۔ اس سے ایک خوش کن آواز پیدا ہوتی جس سے دونوں کے دلوں میں ایک مسرت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ کبھی کبھی پشپا کے فیضیر تاج کو جو کہ دنیا بھر کے خوبصورت پھولوں سے بنا ہوا تھا۔ دل لگی کا سامان بناتا اس کو چومتا۔ اور نیم سحر کی طرح اس سے بے ساختہ ہنسی مذاق کرتا۔ پشپا کو ہنساتا۔ اور خود کبھی کبھی اُس کو بغل میں لے کر غیب زور سے دباتا۔ تاکہ مارے درد کے وہ ترپ اُٹھے۔

مگر پشپا خوبصورت بُت کی مانند بیٹھی ہوئی نیم برہنہ کھڑکی سے قدرتی نظارے دیکھنے میں اس قدر مشغول تھی کہ اس کو اپنے تن بدن کی بھی ہوش نہ تھی۔ اس کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ اس کا پیارا شوہر اس کے پیارے پیارے چاند نما چہرے کو دیکھنے میں محو ہے۔ یا اس کے ساتھ وہ ہمیم کی دُنیا میں جانا چاہتا ہے۔

پشپا کو اس محویت کی حالت میں پاکر شام بھر بیکراں میں غوط زن

اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے اس کے شانوں کو پورے زور سے
دبایا اور کہا۔

”پشپا! پشپا! خیال کس طرف ہے۔ جو اپنے آپ کو بھی عالم وجود
سے باہر لے گئی ہو۔ کہ اگر تم کو خیال کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو ایک خاکی
ذرہ سے کوئی وقت نہ پاؤ۔ آؤ میرے تڑپتے دل کو راحت
پہنچا دو پھونکنی کی طرح بجنے والے کلیجے کو ذرا ٹھنڈک پہنچاؤ۔ پشپا میں
سچ کہتا ہوں کہ چاند کی چاندنی بھی تیرے بے نقاب حسن کے آگے ماند
ہے۔ . . .“

پشپانے اس کو احسان مندانہ نظر سے دیکھی۔ گویا کہ اس کو مجسمہ تصویر
بنادیا۔ اور آخر کار زبان کو جنبش دی۔ ”پیارے ایشور۔ میرے بھگوان
آپ کی کرپا درشتی سے آپ کی داسی ایک ایسا جاؤ جانتی ہے۔ اگر
اس کو عمل میں لایا جاوے۔ تو اس کے زیر اثر یہ تمام دل کش نظارے
مل فریب حسن۔ چاند کی چوری نسیم سحر کا چلنا وغیرہ فوراً ہی حرف غلط
کی طرح سب کچھ آن واحد میں مٹ جائیں“

”پیارسی اگر تم کوئی ایسا ہی جاؤ جانتی ہو۔ تو پر ماتا کسے واسطے
اس کو اس دقت عمل میں نہ لانا۔ ہاں اگر تم کو کوئی ایسا جاؤ وغیرہ آتا
ہو۔ جس سے ایک ماہ میں چار اتوار کی بجائے دس بارہ اتوار آجائیں۔

یا یہ شب اتنی لمبی ہو جائے۔ جتنی کہ تین دن اور رات ملنے سے ہوتی ہے۔ تو بے شک اس جاؤ کو بہت جلدی پڑھو۔

یہ کہنے کے بعد شیام نے اپنے مہندوں بازوؤں سے پشپا کو اپنی آغوش میں کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس نے محبت کا وہ علم پڑھا جس سے شیام اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ تو ادھر پشپا فحتمدانہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے یوں کہنے لگی۔

”پیران ناتھ میں چاہتی ہوں کہ اس پوشیدہ اسرار کو آپ پر روز روشن کی طرح صاف صاف ظاہر کر دوں۔ جس کو میں نے مدت سے دل کی تہ میں آہنی قفل سے بند کر رکھا ہے۔ اور اس کو لبر مرگ پر ہی بتلانے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ مگر آج میں اس کو آپ پر ظاہر کرتی ہوں۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو ان معصیتوں۔ دکھوں۔ غموں کے لئے مضبوط کر لیا ہے۔ جس کے بیان سے۔۔۔ ان کا سامنا کرنا ہو گا۔“

شیام کی دلی آرزو یہی تھی کہ ہنس کر اس کہانی کا خاتمہ کر ڈالوں۔ اور پشپا کو ساتھ لے کر ڈینا۔۔۔۔۔ اور دنیا والوں کی نظر سے بہت دور۔۔۔۔۔ پریم کی دنیا میں چلا جاؤں۔ اور پھر۔۔۔۔۔ وہ خیالی دنیا کی تمہید بنا رہا تھا۔ کہ باہر سے کسی کے آنے کی آواز نے اس کی تمام تاروں کو توڑ پھوڑ کر اُس دنیا کو خاکستر کر دیا۔ یہ اس کے بزرگوار والد صاحب

ہر گوبند رائے تھے۔ جو کہ آندھی کی طرح ان کے آرام گاہ کی طرف تشریف لارہے تھے۔ ان کی آمد نے دونوں پر سکتہ کا عالم کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو مایوس نہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں ہر گوبند رائے کمرے کے نزدیک آئے۔ اور کڑک کر بولے۔۔۔ "شیام! میں حکم دیتا ہوں کہ تم اس خوبصورت ناگنی سے فوراً ہی خود کو الگ کر دو۔ تاکہ اس کے زہریلے اثر سے سارا خاندان ملیامیٹ نہ ہو جائے۔"

شیام نے حیرت سے اس کے چہرے پر نظر کی۔ تو اس کی شاننی۔ پورن شاننی روپ میں پایا۔ وہاں پر غم و الم کے کوئی نشان نہ دیکھے۔ مگر اس کے دل کے پردوں سے نکل کر ایک سرد آہ نے لب داستان کا بوسہ لیا۔ اور اس پاس کے مجولیوں پر بر فانی سردی کا اثر پیدا کیا پھر خوبصورت مجسم تصویر کی طرح دیوار کی مدد سے بیٹھ گئی۔

پہلیے کے کانوں کے پردوں کو پھاڑنے والی بلند آواز "پی کہاں۔ پی کہاں" بدستور جاری تھی۔ نسیم سحری بدستور چل رہی تھی۔ چاند بھی ویسا ہی روشن تھا۔ تمام قدرتی منظر ویسے کے ویسے ہی تھے۔ مگر اب ان کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ دونوں کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔ دونوں تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کافی کوسوں پڑے ہوئے الگ الگ مریخ بسمل کی باج تڑپ رہے تھے۔

— (۲) —

شیام نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سخت بے قراری کے ساتھ دریا
کیا۔ ”کیا یہ سب جھوٹ نہیں؟“
”نہیں۔ بلکہ سچ ہے،“ پشپا نے سر کو نیچے کرتے ہوئے محبت آمیز
الجہ میں کہا۔

”افسوس کہ تم نے اس سے پہلے کبھی بھی کچھ نہ بتلایا۔“
”میں سچ کہتی ہوں کہ میں نے ہر چیز کوشش کی۔ اپنی ہمت کو کامیاب
لائی مگر لبوں نے کبھی بھی ساتھ نہ دیا۔ جس کی وجہ سے میں ہمیشہ ہی بتلانے
میں ناکامیاب ہوتی رہی۔۔۔۔۔ آہ! میں ایک خوفناک پراسرار عورت
ہوں۔“

”پشپا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سے تمام داستان سُن لوں اور جب
تم بھی حرف بگڑتے دو۔“

پشپا نے آہستہ آہستہ دل کی تاروں کو ٹھیک کیا اور پھر نرم نرم
آواز سے بجانے لگی۔ اس کی عجیب رکتی ہوئی آوازیں۔۔۔۔۔
ایک خاص درد تھا۔ جس درد کی ڈھ تاب نہ لاسکی۔۔۔۔۔ اس کا
نازک بدن چنتا کی چقا پر جل رہا تھا۔ جس کا دھواں اس کی نرگسی آنکھوں سے
آنسوؤں کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اور دل لوہار کی پھونکنی کی طرح بج

رہا تھا۔ مگر شیمام نے اس کی درد بھری داستان کو سنا۔ ایک مرد آہ کیسا
اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ پشپا دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ کہ اس کی دنیا
ہمیشہ کے لئے اُجڑ گئی ہے۔ شہاگ کا سماں خواب و خیال ہو گیا ہے۔
مگر اس کے چہرے سے یہ ثابت ہو رہا تھا۔ کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی
ہے۔ اور تمام مصیبتوں کو معمولی سمجھ کر مردانہ دار مقابلے کے لئے دُٹ گئی
ہے۔ اور ان باتوں کو معمولی خیال کر رہی ہے۔ مگر کبھی کبھی اس کو پتی کی
گذشتہ محبت بے چین کر دیتی ہے۔ اور پھر اپنے آپ کو پتی سے کوسوں
دُور دیکھتی ہے۔ محبت کی دنیا کو زیر و زبر دیکھتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد
پھر اپنے آپ کو سنبھال لیتی اور تصور کرتی کہ کس طرح میرا پتی میرے ساتھ
پریم و الفت سے پیش آتا تھا۔ درد بھری باتوں سے میرے دل کی دُنیا میں
آرام و سکون کو تلاش کرتا تھا۔ جب میں اس کی پریم بھری باتوں میں آکر
ہنستی تھی۔ تو اس کی زندگی کا باغیچہ از سیر نو سرسبز و شاداب نظر آتا تھا۔
قدم قدم سے خوشی و مسرت چمکتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مجھ ذلیل عورت میں
جذب کر دینا چاہتا تھا۔ مگر آہ وہی اب مجھ سے کوسوں دُور بھاگ جانے
کی کوشش کر رہا ہے مجھ کو ایک بوجھ محسوس کر رہا ہے۔ خوشی کی جگہ غموں
کے سمندر میں غوطہ زن ہو رہا ہے۔ آہ! کیا محبت یہی ہوتی ہے۔ کہ مذہب
کی ایک ہلکی سی چوٹ سے محبت کی دنیا اُجڑ جائے۔ کیا محبت ایک ایسی

کھانے والی چیز ہے۔ جس کو مذہب کا منہ بہت جلدی نکل جاتا ہے۔ اور کھانے کے بعد ڈکار بھی نہیں لیتا۔ کیا محبت ایک ستار کی مانند ہے جو مذہب کی ایک ہی چوٹ سے درہم برہم ہو کر ٹوٹ جائے۔ آہ! یہ محبت نہیں۔ بلکہ محض مطلب براری ہے۔ محبت! سچی محبت! جس کو دنیا بھر کی طافیں بھی نیست و نابود نہیں کر سکتیں۔ ملک الموت کا فرشتہ بھی سچی موت کو نہیں مار سکتا۔ جب تک دنیا قائم ہے۔ محبت قائم رہے گی۔ محبت وہ چنگاری ہے جس سے تمام مکان جل کر تباہ و برباد ہو جانے کے بعد بھی اس کی راکھ میں موجود رہتی ہے۔ تو پھر میں دیکھوں گی ایک مذہب کیا تمام مذہب بھی محبت کی تار نہیں توڑ سکتے۔ ہم دونوں کو الگ الگ کر سکتے ہیں۔ مگر پریم کی دنیا میں اکٹھے ہی رہیں گے۔

اُف . . . آہ . . . بھوڑی دیر ہوئی۔ کہ اس کے پیارے پتی نے یہ کہا تھا۔ ”رات۔ خوبصورت رات کو بڑھا دو“۔ مگر قدرت نے رات میں اضافہ کیا کہ گزرنے میں نہ آتی تھی۔ پیپہا کی تڑپا دینے والی آواز پنی کہاں۔ پنی کہاں، اس زخم خوردہ دل پر نمک پاشی کا کام کر رہی تھی وہ ہلکی ہلکی نسیم سحر جو پہلے بہت خوش کن محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس کے دل کے تاروں کو بالکل ہی نیست و نابود کر دینے کے درپے تھی۔ چاند کی چاندنی اس کو اب سُنگتے ہوئے چنگار سے معلوم ہوتے تھے۔ اور خود کو ان پر تڑپتی

مخصوص گر رہی تھی۔

(۱۴۱)

تمام شب شیام نے آنکھوں میں گزاری۔ جب صبح کے پرندے نے ملکہِ شب کو بھاگنے کا پیغام دیا۔ تو اس کی جان میں جان آئی۔ لباس کو تبدیل کر کے سیدھا تیر کی طرح ”اندر سین“ کے عشرت کدہ پر گیا۔ اندر سین نے پریم سے کہا:-

”شیام تمہارے رُبخ انور پر غمی کے بادلوں نے کیوں مورچہ لگا

رکھا ہے؟“

”اب یہی بادل تم پر برسیں گے۔ پانی کی بجائے پتھر کی صورت میں۔ کیونکہ تم نے ہماری برادری کو برباد کر دیا ہے۔ اور ہمارے خاندان کے چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا ہے۔ مجھ کو ترک گنڈیں دھکیل دیا۔ اب تمہیں اسکا پھل بھگتنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ سب تمہاری ذات سے ہوا ہے۔ بس اب تیار ہو جاؤ۔“ جوش سے شیام نے کہا:-

”میں آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ کہ تم نے ہم کو اپنے سینے سے لگا کر پاک و صاف کیا۔ اور میرے خاندان کے سچے ہمدرد اور خیر خواہ ثابت ہوئے۔۔۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟“ اندر سین نے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔

کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ میری خاطر آپ کو کوئی تکلیف ہوئی۔ یا خاص مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ بلکہ میرا تو یہاں تک خیال ہے۔ کہ میں تو آپ کو باپ کی طرح مانتا تھا۔“ شیام نے آواز کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”شیام۔ ان باتوں کا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے میں ایک سوال کرتا ہوں۔ جس کا جواب دینے کے بعد آپ ہر طرح کے جواب مجھ سے دریافت کریں گے۔“ اندرسین نے غم سے پُر دروازے میں کہا۔

”میں آپ کی بات کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ بخوشی دریافت کریں۔“

”آہ! میری نیک سیرت لڑکی۔ دیوتاؤں جیسی خلعت رکھنے والی۔ لڑکی نے اپنے باپ کی کوئی نقصان نہ پہنچایا تھا لیکن میرے خیال میں اس وقت تیری عمر۔۔۔۔۔ بہت ہی چھوٹی تھی جس کی وجہ سے تم کو تمام حالات سے آگاہی نہیں ہے۔ اب ذرا حوصلہ کر کے سنو۔ جو کچھ میں کہوں گا۔ اس کو بخوشی سنو۔“

”ہاں۔ ہاں۔ سنناؤ۔ میں بخوشی سنوں گا۔“ شیام نے جواب میں کہا۔

”اچھا۔ اب بغور سنو۔ اس وقت تمہاری عمر بہت تھوڑی تھی جبکہ میرے داماد نے میری کل وقتی لڑکی کے تمام زیورات وغیرہ کو اپنے قبضے میں

کہے اس کو زبردستی میرے گھر میں بھیج دیا۔ اور خود چوروں کی طرح انگلیٹن چلا گیا۔ شایام۔ پیارے شایام۔ اب تم جوان ہو۔ عقلمند ہو۔ اب اندازہ لگاؤ۔ کہ اس وقت میری اور میری لڑکی کی حالت کیا ہوگی۔ ہم دونوں قہر درویش برجان درویش تھے۔ خدا کا شکر کرتے کرتے پانچ سال گزریے۔ تو وہ بھی بیرسٹر بن کر واپس آ گئے۔ اس وقت تم کلکتہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس وقت تمہارے ہزرگوار والد صاحب نے تمام برادری کو اکٹھے کر کے خود ان کے سرکردہ لیڈر بن گئے۔ اور ان سے عہد و پیام لے لیا۔ کہ اگر میں اپنی لڑکی بیرسٹر صاحب کے ہاں بھیج دوں تو وہ تمام کے تمام میل حقہ پانی بند کر دیں گے۔ اور برادری سے خارج کر دیں گے۔ مجھے جب ان باتوں کا پتہ لگا۔ تو میں نے تمہارے باپ کے پاس ہر چند منت سماجت کی مگر لا حاصل۔ آخر کار پاؤں پر سر رکھ کر اتنا رویا کہ جتنا میرے سر میں پانی تھا۔ مگر بے فائدہ۔ اور کسی صورت میں بھی نہ مانے۔ میں نے ہر چند کوشش کی اور کہا کہ میں اس لڑکے کو پنڈتوں سے شددھ کر لیتا ہوں۔ آپ جو سزا دیں۔ میں اس کو برداشت کر لیتا ہوں۔ مگر وہ نہ مانے۔ وہ اپنی ضد پر بدستور قائم رہے۔ آخر کار میں نے کہا۔ کہ آپ میری اور میری لڑکی کی عمر تباہ نہ کریں۔ میرا خاندان صفحہ ہستی سے حروب غلط کی طرح ہٹ جائے گا۔ آپ رحم کریں۔ مگر وہاں پر رحم کہاں۔ انہوں نے

زبردستی سے کام لیا۔ اور مجھے ٹھوکریں مار کر باہر نکال دیا۔ میں وہاں سے روتا ہوا گھر آیا۔ قوم اور گاؤں کو آخری نگاہ سے دیکھا۔ اور حضرت بھری نظروں سے قوم اور گاؤں کو چھوڑ دیا۔ خود کلکتہ چلا گیا۔ مگر آنحضرت پھر بھی میرے سایہ کی طرح میرے ہمراہ رہے۔ اور طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرتے رہے۔ حتیٰ کہ میرے لڑکے کی منگنی ہو گئی۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہو گئیں۔ صرف دو تین دن کا وقفہ تھا کہ تمہارے مہربان والد صاحب نے لڑکی والوں کو کہہ سن کر رشتہ منسوخ کرا دیا۔ پیارے شیاہ۔ اب تم ہی ان حالات کا پتہ لگاؤ۔ کہ میرے دل پر کس قدر صدمہ ہوا۔ لیکن ابھی سنتے جاؤ۔ ابھی ابتدا ہے۔ بہت ہی دکھ و غم و فربہ داستان ہے۔ سنو

جس وقت تم کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس وقت ایک متمول آدمی راجکمار تمہارے مکان کے ساتھ والے مکان میں باقی ماندہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اب اس مہربان خانی سے کوچ کر گیا ہے اسکی زندگی کا سرمایہ صرف ایک معصوم بیوہ لڑکی پشپارہتی تھی۔ جو کہ ایک بہت ہی تنگدست غریب ورزی کی نشانی تھی۔ لڑکی حُن میں لاثانی تھی اس کے آگے چاند کی روشنی ماند تھی اس کے حُن کا تذکرہ جگہ بہ جگہ ہوتا تھا۔ اس بوڑھے برہمن کو ہر وقت یہی فکر دامگیر رہتی تھی۔ کہ کسی کیسی طرح

سے پُشپا کو کلچ کے عیش پرست طالب علموں سے بچاؤں۔ ایسا نہ ہو۔ کہ وہ کسی کی محبت میں پھنس کر تمام خاندان کو کلنک کا ٹیکہ لگائے۔ اور خود طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرے۔ مگر تم ہی بتاؤ کہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی اپنے جذبات کو کہاں تک پوشیدہ رکھ سکتی ہے۔ اور اپنے دل کے ارمانوں کو دبا سکتی ہے۔ اس نے اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے مکان کی چھت پر کسی نہ کسی بہانے سے چلی جاتی تھی۔ اور کوشش کر کے اپنے جہربان کو ڈھونڈ لیتی تھی۔ میرا یہاں تک خیال ہے کہ اس کے پرستار تم ہی تھے۔ کیونکہ ان دنوں تم کو بھی پڑھنے کا از حد شوق تھا اور وہ شوق عموماً مکان کی دوہری چھت پر پورا ہوتا تھا۔ ادھر وہ بھی اُدھر جاتی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تم دونوں میں باہمی گفتگو ہوئی یا نہیں۔ مگر یہاں تک تو ضرور ہوا۔ کہ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک ہونے کے خواہشمند ہونے لگے۔ اور راہِ عشق کی منزل میں بڑھ بڑھ کر قدم مارنے لگے۔ مگر عزیزِ شامِ عشق۔ مُشک۔ کھانسی وغیرہ چھپانے سے نہیں چھپ سکتی۔ گو اس نے بوڑھے براہمن کو ہر چند دھوکا دیا۔ مگر پھر بھی اس پر ہر بات ظاہر ہو گئی۔ کیونکہ وہ گھریلو کام میں غلطیاں پر غلطیاں کرنے لگی۔ دل گھر سے اُچاٹ ہو گیا۔ ہر وقت اُداس۔ غمگین رہنے لگی۔ جس سے صحت بھی بہت جلد بگڑ گئی۔ کبھی پیٹ درد کا بہانہ کرتی۔ کبھی

سردرد کا اور کبھی ردودھوکہ دل کا غبار نکالتی۔ مگر اس بوڑھے برہمن کو اس محبت کے مرض کا بالکل پتہ نہ تھا۔

آخر کار وہ اس راز سے واقف ہو گیا کہ تم دونوں میں بہت گہری دوستی ہو گئی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو پریم کی نظر سے دیکھتے ہو۔ اور آنجناب کالج کو خیر باد کہہ کر زیادہ وقت چھت پر کتاب لے کر جا بیٹھتے ہیں۔ اور عشق کی کتاب کا مطالعہ کرتے۔ اور جو اس کے رُبح النور سے ظاہر ہوتا۔ اس کو ازبر کرتے۔ ایک دن تم دونوں سے تنگ آکر میرے پاس صلاح و مشورہ کے لئے آیا۔ اور آپ کی محبت بھری داستان شروع سے آخر تک حرف بحرف سنا دی۔ میں نے جواب میں کہا ”پنڈت جی عرصہ مدید سے آپ کی آرزو تھی۔ کہ کب سبکدوش ہوں اور کب بنارس کی یاترا کروں۔ اب وقت ٹھیک ہے۔ پانڈوں بھی جاتے ہیں۔ اس لئے تم کل یا پرسوں یاترا کے لئے تیار ہو جاؤ۔ باقی رہی پشپا۔ سو اس کو میں اپنی نگرانی میں رکھتا ہوں۔ اس کا آپ سے زیادہ محافظ ہوں گا۔ پنڈت جی کو میری صلاح پسند آئی۔ اور وہ بخوشی یاترا کے لئے چلا گیا۔ پھر میں نے اس لڑکی کو لے کر گدا دھر کے پھر دیکھا۔ اور عوام میں پشپا اس کی لڑکی مشہور کر دی۔ ہر فرد بٹشرو یقین ہو گیا۔ کہ وہ پنڈت گدا دھر کی لڑکی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ طہور پڈر

ہوا۔ اس سے تم کو اچھی طرح خبر ہے۔ پیارے شیام۔ اب تم پر ہر ایک بات ظاہر کر دی ہے۔ جس سے میرے دل کا درد بھی کم ہو گیا ہے۔ دل کا غبار نکل گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک نہایت دلچسپ کہانی ہے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ اس کہانی کو لکھ کر چھپوا دیں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ میری قلم میں طاقت نہیں۔ لوگوں کو خیال ہے کہ میرا فرزند ارجمند کہانی لکھنے میں یکتائے زمانہ ہے۔ سو اس کو سن کر دل بلیوں مچھل پڑا اور دل میں خیال کیا۔ کہ اس سے اس کہانی کو لکھواؤں گا۔ میں آپ کا بہت شکریہ ادا کروں گا۔ اگر تھوڑی سی مدد تم بھی دو۔ تاکہ سب مل بلا کہ کہانی کو ختم کر دیں۔

شیام نے تمام باتوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا: ”کیا پیشانہادی پر جلد رخصت مند ہو گئی تھی؟“

اندر سین نے جواب دیا۔ ”یہ بہت انوکھی بات ہے۔ کہ پر ماتما سرو شکتیمان نے عورتوں کے دلوں میں ایک خاص جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ کیونکہ جب وہ زبان مبارک سے ”نہ“ کہتی ہیں۔ تو ان کا مطلب ”ہاں“ سے ہوتا ہے۔ جب اس کو گداگر دھڑکے مکان میں لایا گیا۔ تو اس کی تمام حرکات و سکنات پاگلوں۔ دیوانوں جیسی ہو گئیں لوگ اس کو پاگل کہنے لگے۔ پیارے شیام! لیکن وجہ یہ ہے۔ کہ اس کو

نظر نہ آنے تھے۔ ادھر آپ بھی بے چین ہو گئے۔ دیوانوں کی طرح اس کی کھوج میں نکل پڑے۔ مگر ایشور کی کمر پائے کہ تم بہت جلدی بہت جلدی کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ تم نے اس کو پالیا تھا اور تم اپنا کالج اس کی گلی میں بناتے تھے۔ ایک نیم برہنہ کھڑکی میں سے تم دونوں ایک دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ اور آہوں سے تمام آسمان کو چھپا دیتے تھے۔ چونکہ مجھ کو تم دونوں سے خاص الفت تھی۔ جس کی وجہ سے تم دونوں کی تکلیف کو برداشت نہ کر سکا۔ تم کالج کو ہمیشہ سے چھوڑنے کا خیال کرتے تھے۔ ادھر پشپا بھی مریضِ عشق کی طرح دن بدن کمزور اور دُلی ہوتی جاتی تھی۔ سو اس خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک دن پشپا کو میں نے اپنے ہاں بلایا۔ اور بڑے پریم بھاد سے بٹھلایا اور کافی باتوں کے بعد کہا کہ تو میری بیٹی ہے۔ بیٹی کو باپ سے شرم کیسی۔ دوسرے میں آپ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ سو اس لئے اپنی شرم کو بالائے طاق رکھ کر میں جو کچھ پوچھوں اس کا جواب دیتی جاؤ۔ پشپا تم سن کر حیران ہو گئی۔ کہ میں تمہارے چاہنے والے دلبر سے بھی طرح واقف ہوں۔ دونوں کے حالات سے آگاہ ہوں میری خواہش ہے کہ تم دونوں کو ہمیشہ کے لئے اکٹھا کر دوں۔ یعنی شادی کر دوں۔ جس سے دونوں کی زندگی بخوشی بسر ہوگی۔ یہ بات سن کر وہ بچوں

بچوں کی طرح رونے لگی۔ اور بغیر کوئی جواب دیئے چپ چاپ چلی گئی۔
 میں اس کی شرم کو محسوس کر کے رہ گیا۔ اس کے بعد میں اُسے کئی بار
 بلا۔ اور ہر بار آپ کی بابت بات کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی
 شرم بھی دور ہو گئی۔ اور میں نے اس سے وعدہ کیا۔ کہ تم رمضان مند ہو
 جاؤ۔ تو میں تمہاری شادی اس سے کر دوں گا۔ تو پھر اس نے جواب
 دیا۔ ”یہ ناممکن بات ہے“ میں نے حوصلہ سے کہا۔ دُنیا میں ناممکن
 بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کا تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں اس کا اچھی
 طرح انتظام کر دوں گا۔ یہ تو تم کو معلوم ہے کہ تمام گلی محلے میں تم ایک
 بہن کی لڑکی مشہور ہو گئی ہو۔ تو پھر فکر کس بات کا ہے۔ اس کے بعد بہت
 لمبی چوڑی گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا کہ تمہاری خواہش کیا
 ہے۔ سو میں نے جواباً کہا۔ بیٹی تم تو ایسی باتیں کرتی ہو۔ جیسے کہ مجھ کو
 کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ مجھے ہر بات سے واقفیت ہے۔ وہ تو دیوانوں
 کی طرح تمہارے گرد چٹکتے لگایا کرتا ہے۔ پس ان باتوں کو جانے دو۔
 اور چپ چاپ شادی کی رسم ادا ہو جانے دو۔ پچھلے ارمان مت
 نکالو۔ جو کچھ ہو گا۔ اچھا ہی ہو گا۔ تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ اور شادی
 ہو جانے دو۔ پھر کسی قسم کا خدشہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ راز تا قیامت تک
 ظاہر نہ ہو گا۔

میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس کا ولی مقصد شادی کرنے کا تھا یا نہیں
 لیکن جب کبھی میں کہتا کہ چھوڑو ان باتوں کو۔ تو اس کے چاند جیسے
 چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں۔ اور ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتی جب
 غم کا بوجھ زیادہ ہو جاتا۔ تو اس کی آنکھیں اس کی مدد کرتیں۔ تو
 ساون بھادوں کی جھڑی بندھ جاتی۔ پھر اس کے بعد وہ مجھ سے لفظ
 بن جایا کرتی تھی۔ جب میں نے اس سے ہر طرح کی تسلی کر لی۔ تو
 پنڈت گدادھر کو آپ کے باپ کے پاس بھیجا۔ معاملہ ظاہر کیا گیا اور
 تم دونوں بہت خوش ہوئے۔ اور بغیر کسی وجوہات کے شگن لینا منطوق
 کر لیا۔ جس سے تمام بات ختم ہو گئی۔

جب وہ دن قریب آنے لگا۔ تو اس کی طرف سے بھی صد کا سمنہ
 موجزن ہونے لگا۔ اور اس کی ہر بات پکارتی تھی۔ میری شادی اس
 سے نہ کرو۔ اس شادی خانہ بہادی کو روک دو۔ جب میں نے
 اس کی ایسی باتیں سنیں۔ تو زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ جو اس باختم
 ہو گئے۔ میں نے ہر چند مدت خوشامد بھی کی اور آخر کار رو دیا اور کہا۔
 بیٹی! اب تیرے مکان سے نکل چکا ہے۔ اس کا واپس آنا قطعی ناممکن ہے۔
 اب جبکہ شادی کا دونوں طرف سے مکمل انتقام ہو چکا ہے۔ تو پھر
 کیسے بات بنے۔ تو اس کے جواب میں اس نے کہا۔ کہ لوگوں میں مشہور

کر دو کہ میں ہمیشہ کے لئے میٹھی میند سو گئی ہوں۔ تب میں نے کہا۔ کہ اگر بفرغِ محال یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر کر دوں کہ تم موت کی گود میں سو گئی ہو۔ تو پھر اس کی زندگی دو بھر ہو جائے گی۔ اور وہ اس مصیبت کو برداشت نہ کر سکے گا۔ جھٹ پٹ جان دے دیگا۔ اس کے بعد بھی تم اس کی ساتھی بنو گی۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ دو جانوں کا پاپ میں اپنے سر پر لوں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا۔ پشپا ایشور کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔ اور اپنی ضد کو چھوڑ دو۔ ایشور تمہاری بھی لاج رکھے گا۔ کیونکہ وہ ہی سب کا مالک ہے۔

پشپا جو ہونے والا ہے۔ اس کو ہو جانے دو۔ میں تمہارا تازہ زندگی احسان مند رہوں گا۔ میری تفسیر نے جادو کا اثر کیا۔ اور وہ ہار مان گئی۔

غرضیکہ تم دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔ غریب غرباء میں بہت زرو مال لوٹا یا گیا۔ خیران تمام باتوں سے تم کو خبر ہے اب میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ اور میں خوش و خرم رہنے اس کے بعد تم کو تمام باتیں یاد ہیں۔ جبکہ تم نے ایسا بڑا کام کیا۔ تو پھر تم خاموش کیوں نہ رہے۔۔۔۔۔ کیوں خواہ مخواہ سوئی ہوئی بات کو ظاہر کیا۔“

اندر سین نے بڑے تسلی بخش لہجہ میں کہا۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں تمہارے باپ سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس نے کس طرح میری دل شکنی کی تھی۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جان بوجھ کر تمہاری شادی اس بیوہ سے کی گئی تھی۔ میرا فرض تھا۔ سو میں نے ادا کیا۔ اور تمہاری جاتی کے مان کو نشٹ کیا لیکن اب جبکہ تمہاری ہمیشہ کی برات آنے والی تھی۔ تو میرے دل میں ایک خاص درد اٹھا۔ جس کے درد سے میں سخت بے چین ہو گیا۔ کہ اب دوسری جاتی کو خراب نہ کیا جائے۔ اور ان کے پاس جا کر کہا۔ کہ تم جس لڑکی کو بیاہ کر لاؤ گے۔ وہ لڑکی شوہر ہے۔ اس کا ثبوت میرے پاس ہے۔ وقت آنے پر ثابت کر دوں گا۔

شیام نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ”اب پشپا کی زندگی کا کیا حشر ہوگا۔ کیونکہ میں نے اس کو گھر سے نکال دینا ہے۔ اس کی زندگی کس طرح بسر ہوگی؟“

اندر سین نے کہا کہ اس کا جواب میں کیا دوں۔ تمہارے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہے۔ اب تم جانوایا۔ وہ مجھے اس سے کیا غرض؟ شیام سے اب ضبط کا حوصلہ باقی نہ رہا۔ اور سرد آہیں بھرتا ہوا اٹھا اور گھر واپس آیا۔ اندر سین نے ہر چند کوشش کی کہ وہ اس کے

گھر ٹھہرے۔ مگر شام نہ ٹھہرا۔ چلا ہی گیا۔

(۴)

ملکہ شب اپنی کالی چادر چاروں طرف بچھا چکی تھی۔ جانوروں کو آرام و راحت کا پیغام دے چکی تھی۔ تالاب کے کنارے پر بڑے بڑے لچے کے درخت سیاہ لباس پہنے ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے۔ ان کا سایہ بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ ہوا بھی بیوہ کی طرح سرد آہیں بھرتی ہوئی۔ کسی کے غم میں شریک ہو رہی تھی۔ آج کالے آسمان پر بھی ستارے بہت بے چین نظر آ رہے تھے۔ ان کو بھی کسی کا دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

ملکہ شب نے اپنی تمام جگہوں پر سلطنت کا ڈنک بجا دیا تھا۔ اور ویوار اس کے زیر اثر تھے۔ شام اس کھڑکی میں پہلے یہاں بیٹھا کرتا تھا۔ بستر پر ہر خاموشی لئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کی سرد آہ کبھی کبھی کمرے کی تاریکی کو سرد کر دیتی تھی۔ پشپا بھی بُت کی طرح فرش زمین پر بیٹھی تھی۔ اور اس کے نازک نازک ہاتھ پر ان ہاتھ کے چرنوں کو پکڑے ہوئے تھے اور آنکھوں سے گنگا جنارواں تھی۔ خاموشی ہی خاموشی طاری تھی۔ ہوا بھی ان کو دیکھ کر سہم گئی۔ اور ایک تاریک کو نے میں جا بسی۔

باہر سے کسی کے آنے کی آواز آئی۔ یہ اُن کے پتا تھے۔ انہوں نے آتے ہی بلند آواز میں کہا: ”شیام! میرا حکمنامہ پانچ دن سے جاری ہو چکا ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ تم نے اس کی بالکل تکمیل نہیں کی۔ بس اب سنبھل جاؤ۔ اور اس ناگنی کو جتنی جلدی ہو سکے گھر سے باہر نکال دو۔“

ان لفظوں کو سن کر ان دونوں پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ پشپا نے دیوانوں کی طرح شیام کے چرنوں کو کپڑا لیا۔ اور زار و قطار رونے لگی۔

شیام اپنے آپ کو سنبھال باہر آیا۔ اور کہا۔

”میرے مہربان پتاجی۔ میں اب اس کو جُدا نہیں کر سکتا۔ یہ میری

مختی۔ میری ہے اور میری۔۔۔ رہے گی۔“

اس کے پتا نے کڑک کر کہا۔

”کیا اپنے خاندان کو بدنام کر دو گے۔ اس کا چراغ گل کر دو گے؟“

شیام نے کہا۔ ”محبت کے آگے یہ تمام بیچ ہیں مجھے ان باتوں کی کچھ پروا نہیں۔“

تب اسکے پتا نے کہا ”تو جاؤ۔ میں تم کو گھر سے باہر نکال دیتا ہوں۔ میرے ناخلف

بیٹے۔ میری آنکھوں سے دُور ہو جاؤ۔“ یہ کہہ کر چلا گیا شیام ایک سرداہ

کے ساتھ مکان سے باہر ہو گیا۔ یہ ہے شعلہ بھض!

شُعْلَمُول

افسانہ نمبر ۱۳۸

عرضِ مدعا

صرف اتنی خواہش ہے کہ کچھ دیر کے لئے مجھے اپنے پاس بیٹھنے دے
جو کام مجھے کرنے ہیں۔ انہیں پھر کروں گا۔

تجھ سے انک ہو کر میرا قلب راحت و آرام سے بالکل بے بہرہ ہو
جاتا ہے۔ میرا کام محنت کے تھکاہ ساگر میں بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

آج میرے دریچہ میں سرد آہیں بھرتے ہوئے موسم بہار کا دیوتا داخل
ہو رہا ہے۔ اور شہد کی مکھیاں شگفتہ پھولوں پر ایک عجیب راگ الاپ
رہی ہیں۔

اب تیرے مقابل خاموش بیٹھ جاؤں۔ اور زندگی کا آخری گیت
گائوں۔



شعلہ دل

میں اور میرا ایک دلی دوست ایک دن ریل میں بیٹھے ہوئے کلکتہ جا رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک آدمی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مسلمان لباس میں تھا۔ اس کی باتیں سن کر حیرانی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ دُنیا کی ہر بات کے سلسلے میں وہ اس طرح باتیں کرتا۔ جیسے ایشور پہلے اُسی سے مشورہ کر کے سب کام کرتا ہے۔ دُنیا میں جتنی بھی اچھی یا بُری سازشیں ہوتی ہیں جیسے روسیوں کا ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ۔ انگریزوں کی پوشیدہ چالیں۔ ان سب کے معاملہ میں کچھ بھی نہ جانتے کے سبب سے ہم لوگ اس کی باتوں پر یقین کرنے لگے۔ ہمارے نئے دوست نے

”مسکرا کر کہا ”دنیا میں جتنی باتیں ہوتی ہیں۔ اُن کا ذکر تو آپ کے اخبار والے کر ہی نہیں سکتے“

گھر سے دُور جانے کا پہلا موقع تھا۔ ہم تو اس کی باتیں سن کر منّاٹے میں آ گئے۔ وہ آدمی بہت ہی عالم تھا۔ کبھی لیکچر دینے لگتا۔ تو کبھی فارسی کے شعر بولتا۔ لیکچر اور فارسی کے شعروں میں اپنا دخل نہ ہونے کے سبب ہم اس کی ہر بات کے زیرِ اثر ہونے لگے۔ یہاں تک کہ میرے دوست کے دل میں یقین ہو گیا کہ یہ ہمارے نئے دوست ضرور کسی خاص سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس آدمی کی ہر معمولی بات کو بھی بڑے غور سے سننے لگا تھا۔ اور کسی کسی بات کو اپنی پاکٹ بک میں لکھتا جاتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے دوست کی اس حرکت کو دیکھ کر وہ آدمی بہت ہی خوش ہے۔

گاڑی آ کر لکھنؤ جنکشن پر ٹھہری۔ ہم لوگ دوسری گاڑی کے انتظار میں دیننگ روم میں جا بیٹھے۔ راستہ میں انجن کی خرابی کی وجہ سے دوسری گاڑی بہت دیر سے آئے گی۔ یہ سن کر میں ٹیل کے اوپر بستر بچھا کر سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ کہ اُس آدمی نے یوں کہنا شروع کیا کہ نظام ریاست کے متعلق دو ایک باتوں میں اختلاف ہونے کے سبب سے جب میں ریاست بھونگا گڑھ کا کام چھوڑ کر حیدر آباد کے نظام

کے ہاں نوکر ہو گیا۔ تب مجھے نوجوان اور مضبوط آدمی دیکھ کر بھڑوچ میں ٹٹی کا محصول وصول کرنے کی نوکری دی گئی۔

بھڑوچ بہت اچھی باؤنق جگہ ہے۔ پہاڑ کے نیچے گہری کھدوں میں سُست اندی پتھر ملیں بیڑھی بیڑھی بہہ رہی ہے۔ ٹھیک اسی ندی کے کنارے پہاڑ کے نیچے پتھر کے پندرہ صد زینوں والے گھاٹ کے اوپر ایک سنگ مرمر کا محل بنا ہوا ہے۔ اس کے ارد گرد کوئی آدمی نہیں رہتا۔ بھڑوچ کا بازار اور گاؤں یہاں سے بہت دور واقع ہے دو سو برس کے قریب ہوئے ہوئے۔ جب شاہ محمود نے اپنے عیش و عشرت کے لئے یہ محل تعمیر کرایا تھا۔ اُس وقت محل کے حمام کے فواروں سے گلاب کا عطر برساکہ تا تھا۔ اور اسی جگہ سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر فارس کی نوجوان بیگمیں نہانے سے پہلے سر کے لمبے بال کھول کر ستار کو گود میں رکھ کر غزلیں گایا کرتی تھیں۔

اس وقت نہ تواب وہ فوارے ہی چھٹتے ہیں۔ اور نہ وہ گانے ہی ہوتے ہیں۔ سنگ مرمر کے فرش پر اب وہ نازک پاؤں بھی نہیں پڑتے۔ مگر اس وقت وہ مجھ ایسے محصول کلکٹروں کا ٹھکانہ بنا ہوا تھا۔ میں بھی اسی محل میں رہنے لگا۔ لیکن دفتر کے بڑھے چپڑا سی فضل خان نے مجھے کئی دفعہ منع کیا کہ میں اس محل میں نہ رہوں۔ ایک دفعہ اس نے

کہا۔ کہ اگر آپ نہیں مانتے۔ تو کم از کم رات کو وہاں نہ جائے گا۔ مگر میں نے ہنس کر بات اُڑادی۔ نوکروں نے بھی صاف صاف کہہ دیا۔ کہ وہ دن کو تو کام کر دیا کریں گے۔ مگر رات کو وہاں نہیں رہیں گے۔ وہ گھرا تباہ نام ہو گیا تھا کہ چور بھی اُس گھر میں گھسنے کا حوصلہ نہ کرتے تھے۔

پہلے پہل آنے پر اس غیر آباد پتھر کے محل میں مجھے بھی کچھ کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ جہاں تک ہوتا تھا۔ میں تمام دن باہر ہی رہتا تھا اور رات کو تھکا ماندہ آکر بستر پر لیٹ رہتا تھا۔

لیکن ایک مہفتہ بعد ہی ایک عجیب نشہ مجھ پر غالب آنے لگا۔ وہاں کئی عجیب اور حیران کن واقعات ہونے لگے۔

گر میوں کے دن تھے۔ بازار میں اتنی رونق نہ تھی۔ کام کاج بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں اُسی دریا کے کنارے آرام کر سی ڈالے بیٹھا تھا۔ ندی سُوکھ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر بالو کے کئی انبار لگے ہوئے تھے۔ جو سورج کی شعاعوں سے دوپہر کے وقت رنگین معلوم پڑتے تھے۔ اس کنارے دریا کے صاف پانی میں شعاعیں جھلما رہی تھیں۔

سورج آہستہ آہستہ پہاڑ کے پچھے پچھے غروب ہو گیا! اسوقت

میری خواہش گھوڑے کی سواری کرنے کی تھی۔ مگر عین اُسی وقت ٹیڑھوں سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ گھوم کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔

شائد مجھے مغالطہ ہو گیا ہو۔ یہ سمجھ کر میں پھر بیٹھ گیا۔ مگر بیٹھتے ہی کسی پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ جیسے بہت سے آدمی میری طرف بھاگے چلے آتے ہیں۔ خوف کے مارے میرا جسم کانپ اُٹھا۔ گو میرے سامنے کوئی آدمی نہ تھا۔ تو بھی مجھے معلوم ہونے لگا۔ کہ اس گرمی کی شام کو کبھی نازک عورتیں غسل کے لئے زینے اتر رہی ہیں۔ گو اس شام کو پہاڑ کے کنارے کے سناٹے میں کہیں کچھ بھی نہ تھا۔ مگر پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ فوارے چل رہے ہیں۔ اور اُن میں سے سینکڑوں دھاروں کی طرح مذاق کرتی ہوئی کئی حسین عورتیں میرے پاس سے نکل گئیں۔ اور مجھ سے ذرا بھی شرمائی تک نہیں۔

میرے سینہ میں ایک اُبال سا اُٹھا۔ دل دھڑکنے لگا۔ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ خوف کی دھڑکن تھی یا خوشی کی۔ بڑی خواہش ہوتی؟ کہ اچھی طرح دیکھوں۔ مگر سامنے دیکھنے کی کوئی پسینہ نہ تھی۔ اچھی طرح کان لگا کر سننے سے اُن کی سب باتیں سن سکتا ہوں۔ مگر حجب کان لگا کر سننے لگا تو پازیب کی آواز کے علاوہ کچھ اور نہ سنائی دیا۔

یکایک ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ دریا کے پانی میں ہل چل مچ گئی۔

وہ ایک دوشیزہ کے بالوں کی طرح ہوا میں بہا رہا تو ٹٹے لگا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ میری آنکھوں کے سامنے کئی نوجوان خوبصورت عورتیں برہنہ دریا کے گھاٹ کی سیڑھیاں سے نیچے اتر رہی ہیں۔ اور پھر پانی میں کھیل رہی ہیں۔ مگر یہ سب وہم تھا۔۔۔۔۔ اس میں اصلیت نہ تھی۔ اس واقع سے میرے دل میں شک گذرا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے اکیلا پا کر کوئی جھوٹ میرے دل میں گھس گیا ہو۔ میں غریب رونی کا محسوس و حصول کر کے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ شاید مجھے یہ اس حالت میں نہ دیکھ سکتا ہو۔ میں دل میں کہا۔ آج خوب کھانا کھانا چاہئے۔ شاید پیٹ خالی رہنے سے ہی یہ خیالات میرے دماغ میں موجود رہتے ہو۔ میں نے باورچی کو بلایا کہ کہا۔ آج کھیر۔ حلوہ۔ پلاؤ وغیرہ سب کچھ بناؤ۔ دوسرے دن بستر سے اٹھنے پر یہ واقعات بہت ہی پُر مذاق معلوم پڑے۔ خوشی خوشی اپنا پیٹ پہن کر کام پر چلا۔ اس دن کام زیادہ تھا۔ اس لئے شام کو دیر ہو گئی جب محل کے نزدیک پہنچا۔ تو نہ معلوم کون کہہ رہا تھا۔ ”تم بہت ہی بے وفا ہو۔ اتنی دیر کیوں کی۔ ہم یہاں انتظار کر رہے ہیں۔“

محل کی سیڑھیوں کے اوپر پہنچتے ہی سامنے کا ہال کمرہ بہت ہی بڑا تھا۔ اس میں تین بڑے بڑے اور اونچے اونچے ستون تھے جن پر

بہت قسم کی مینا کاری کی ہوتی تھی۔ یہ بال ہمیشہ سے ہی سُنان رہتا تھا۔
 آج بھی وہاں روشنی نہ تھی۔ دروازہ کھول کر جیسے ہی میں کمرہ کے اندر
 داخل ہوا ویسے ہی گھر کے اندر گھبراہٹ مچ گئی۔ جیسے بہت سی دوئیز اُیں
 برآمدوں سے ادھر ادھر بھاگ گئیں۔ میں کہیں بھی کچھ نہ دیکھ کر تناٹے
 میں کھڑا کھڑا رہ گیا۔ میرے جسم کے دو ٹکٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ستون
 کے درمیان کھڑا تھا۔ کہ ویسے ہی عطر کی فہک آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوا
 جیسے فوارے چھٹ رہے ہیں۔ اور ان میں کانٹا ہوا پانی جھرجھر کر کے
 سنگ مرمر سے فرش پر گر کر ستارے سجا رہا ہے۔ کبھی نہ یوں کی چھنچھاہٹ
 کی آواز آتی۔ اور کبھی کسی کے گانے کی آواز آتی۔ جیسے کوئل گارہی ہو۔
 میں کھڑا کھڑا پاگل سا ہو گیا۔

اُسی وقت میرا نوکر لیمپ جلا کر میرے پاس لے آیا۔ نہ معلوم اس نے
 مجھے پاگل سمجھا یا نہیں۔ لیکن اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ میں میں ہوں۔
 اور یہ بھی میں نے سوچ لیا۔ کہ اس بات کو تو ہمارے شاعر لوگ ہی
 کہہ سکتے ہیں۔ کہ دنیا میں کوئی خیالی فوارہ بھی چھٹ سکتا ہے یا نہیں۔
 اور کوئی خیالی دوئیز خیالی انگلیوں سے ستارے سجاسکتی ہے یا نہیں لیکن
 یہ ٹھیک تھا۔ کہ رُوئی کا محضلول وُصول کہہ کے ساڑھے تین صد روپیہ
 ماہوار پاتا ہوں۔ تب پھر اپنے پہلے وہم کو یاد کر کے اپنے بستر پر بیٹھ کر

اخبار پڑھتے ہوئے ہنسنے لگا۔

اخبار بینی کے بعد کھانا کھا کہ لیمپ گلی کر کے میں سو رہا۔ میرے سامنے کی کھڑکی سے نظر ڈال کر اندھیرے جنگلی سے گھرے ہوئے پہاڑ پر کوئی چار پائی پر بیٹھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اپنی خیالات میں نہ معلوم میں کب سو گیا۔ اور کب تک سوتا رہا۔ لیکن اچانک ہی چونک اُٹھا۔ گھر میں ضرور کھٹکا ہوا تھا۔ لیکن کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ اندھیرے پہاڑ پر سے دیکھنے والا غائب ہو چکا تھا۔ چاند کی روشنی میرے کمرے کی کھڑکی سے فرش پر میں آرہی تھی۔

کوئی بھی آدمی نہ دکھائی دیا۔ تب بھی مجھے معلوم ہوا۔ کہ کوئی مجھے آہستہ آہستہ دھکیل رہا تھا۔ میرے جاگتے ہی اس نے مجھے اشارہ سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

میں چپکے چپکے اُٹھا۔ لیکن اتنے بڑے محل میں میرے علاوہ اور کوئی بھی نہ تھا۔ تو بھی قدم قدم پر یہ خوف پیدا ہونے لگا۔ کہ میرے قدموں کی آہٹ سے کہیں کوئی جاگ نہ پڑے۔ محل کے سب کمرے بند پڑے رہتے تھے۔ اور ان کمروں میں کبھی گیا بھی نہ تھا۔

اُس رات سانس روکے قدم بڑھاتا ہوا۔ میں اس کے پیچھے کہاں جا رہا تھا۔ میں یقین سے کہہ نہیں سکتا۔ کتنے ہی تنگ اندھیرے استے

کتنے ہی بہ آدمے گزر کر میں اس کے پیچھے جا رہا تھا۔

میری عجیب رہبر۔ مجھے آنکھوں سے دکھائی نہ دی۔ لیکن اس کی صورت میرے دل میں تھی۔ وہ عرب کی عورت تھی۔ ڈھیلی آستین کا کرتہ ٹوپی کے کنارے سے ایک بُرقعہ سا پڑا تھا۔ کمر میں ایک کٹا رہتی۔ آخر کار میری رہبرہ ایک لال رنگ کے پردے کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ اور مجھے بھی اُدھر آنے کا اشارہ کیا۔ سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن دُور کے مارے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس پردے کے سامنے زمین پر کجواب کی پوشاک پہنے ایک حبشی نکلی نوا پاس رکھے دونوں ٹانگیں پھیلائے سو رہا ہے۔ رہبرہ نے اس کی ٹانگیں عبور کر کے پردے کا ایک حصہ کھینچ دیا۔

پردے کے پیچھے فارسی قالین کا فرش تھا۔ تخت کے اوپر کوئی بیٹھا تھا۔ مگر یہ نہ دیکھ سکا۔ کہ وہ کون ہے۔ لیکن سبز رنگ کے کھلے پا جامہ کے نیچے زری کا جو تہ پہنے دو خوبصورت پاؤں مٹھلی گدے پر رکھے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک کنارے ایک تہ پانی پر چاندی کے برتن میں کچھ پھل وغیرہ پڑے تھے۔ اس کے پاس ہی دوسری تہ پانی پر دو جام اور ایک بوتل بڑھیا شراب کی رکھی تھی۔ ایک طرح کا نشہ دینے والی پھلینی پھینکی خوشبو سے میں اپنے آپ کو بھول گیا۔

میں دل کی بے کلی کو دباؤں جب حبشی کی ٹانگوں کو عبور کرنے لگا۔
 ویسے ہی وہ چونک پڑا۔ اُس کی چھاتی پر رکھی ہوئی تلوار زمین پر جھنکار
 کے ساتھ گر پڑی۔

اچانک ہی عجب آواز سن کر میں بھی چونک پڑا۔ دیکھا۔ اُسی
 اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔ جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ چاند کی جگہ
 سورج نے لے لی تھی۔

میرے دن کے ساتھ رات کی سختی دشمنی ہو گئی۔ جاگنے کی تھکاوٹ
 سے جسم سُست ہونے لگا۔ اُسی سُست جسم سے کام کرنے جاتا تھا۔ اور
 اس وقت رات کو بہت ہی منحوس۔ خوفناک اور جادو گرنی سمجھتا تھا۔
 لیکن رات کو دن بھر کے ماندے جسم کو دیکھ کر دن کو بُرا کہتا تھا۔

شام کے بعد میں ایک نشے میں پھنس جاتا تھا۔ تب کوٹ پتلون
 مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔ تب میں خیالات کی دُنیا میں مبتلا ہو کر۔ سر پر نیلے
 رنگ کی مچلی ٹوپی۔ ڈھیلا پاشماں اور مچلی پاپوش پہن کر دِمال کو عطر
 لگاتا۔ اور سیگریٹ کی جگہ بنارسی متبا کو پھا لیتا اور ایک تخت پر جا بیٹھتا تھا۔
 اس کے بعد رات جتنی زیادہ گذرتی۔ اتنا ہی لطف ہوتا۔ جیسے

میں ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے موسم
 بہار کے پھول ہو امیں اُس محل کے کمروں میں اُڑتے پھرتے اور جو تھوڑی

دُور تک تو دکھائی دیتے ہیں۔ مگر بعد میں نہ معلوم کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور میں بھی ان کے ڈھونڈنے کے لئے جیسے بہر کمرے میں گھومتا تھا۔

اسی نشے میں میں حنا کی خوشبو۔ ستار کا بجنا۔ اور اُس دو شیزہ کو ہر دم جا من رنگ کا دوپٹہ اور اُس کے نازک پاؤں میں کا مدار چُوتنا اور چُولدار انگیا۔ اور لعل سُنہری ٹُپی دیکھ کر پاگل سا ہو گیا تھا۔

اُس نے مجھے پاگل بنا دیا۔ میں اُسی کے فراق میں خواب کی دُنیا میں نہ معلوم کس نشے میں مست اُس 'نایا پورسی' کی لگی گلی اور کمرہ کمرہ میں گھومتا پھرتا تھا۔

کبھی کبھی تو میں آئینہ کے سامنے بیٹھ کر خوب سچ دھج کرتا تھا۔ اُسی وقت اچانک دکھلائی دیتا۔ کہ آئینہ میں میرے عکس کے پاس اُسی دو شیزہ کا سایہ پڑتا تھا۔ دم بھر میں گردن ٹیڑھی کر کے اپنی دوٹی موٹی آنکھوں سے اشارہ کرتی اور ایک انداز سے بھاگ جاتی تھی۔ اس وقت میرے دل میں چنگاریاں اٹھتی تھیں۔ میں سچ دھج کر ناچھو کر پاس پڑھی چار پانی پریٹ جاتا۔ میری چاروں طرف پہاڑی ہو امیں جیسے بہت محبت۔ بہت بوسے۔ اٹھکھیلیاں کرتے ادھر ادھر

گھومتے پھرتے تھے۔

ایک دن بغیر سے پہر میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر گھومنے جانے کا ارادہ کیا۔ مگر نہ معلوم کون طاقت مجھے ایسا کرنے سے روکنے لگی۔ لیکن اس دن میں نہ رکا۔ کھونٹی پر میرا کوٹ اور بیٹ لٹک رہی تھی۔ اُسے اتار کر پہننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہوا ایک جھونکا اتنے زور سے آیا کہ میرا کوٹ اور بیٹ میرے ہاتھ سے نکل کر ہوا کی تیزی میں شامل ہو گئے۔

اس دن پھر میرے کوٹ کا نازک گیا۔ میں نے کھانا کھا کر سونے کا ارادہ کیا۔ لیکن آدھی رات گزرتے پھر اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا جیسے کوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ جیسے کوئی میری چارپائی کے نیچے۔ فرش کے اندر۔ اُس محل کی پتھر کی دیوار تلے کسی قبر میں سے کوئی رورو کر رہا ہے۔ ”تم مجھے یہاں سے نکال کر دے چلو“

میں کون ہوں۔ میں کس طرح اور کس دوشیزہ کو اس خوابی دُنیا کی قبر سے کھینچ کر لے چلوں۔ تم اب تک کہاں تھی۔ اے میری جان! تم کس جھیل کے کنارے کھجور کے درختوں کے جھنڈ کی چھایا میں کس گمراہ رُس شہر میں پیدا ہوئی ہو۔ یہ تھے میرے دماغ کے خیالات۔ اُسی وقت چپراسی پاگل کی طرح چلا اٹھا۔ ”اگ رہو۔“

سب جھوٹ ہے "سب آنکھ کھول کر دیکھا تو صبح ہو چکی تھی۔

چپڑاسی نے صبح کی ڈاک لا کر مجھے دی۔ اور باورچی نے آکر پوچھا "آج کیا کھانیے گا؟"

میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب اس گھر میں نہ رہوں گا اُسی دن اپنا سامان اٹھوا کر دوسرے گھر میں رہنے لگا۔ دفتر کا چپڑاسی مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔

جیسے جیسے شام نزدیک آرہی تھی۔ ویسے ہی میں خیال کرنے لگا کہ میں نے کہیں جانا ہے۔ دفتر کے کام میں دل نہ لگا۔ میں قلم پھینک کر بڑا جھڑوہم سے بند کر کے اُسی وقت ٹانگہ پر سوار ہو کر وہاں سے چل رہا۔ دیکھا غائبانہ طاقت سے، تانگہ خود بخود ہی اس محل کے دروازہ پر جاڑکا۔ میں جلدی سے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

آج تمام کمروں میں سناٹا تھا۔ اندھیرا گھر جیسے ناراض ہو کر منہ پھلٹے ہوئے تھا۔ نفرت سے میرا دل تنہا اٹھ گیا۔ لیکن کس کو اپنی نفرت دکھانا اور کس کو روٹھنے سے مناتا اور کس سے محافی مانگتا؟ گھر بھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں بے تاب دل سے ادھر ادھر گھومنے لگا۔ دل گانے کو لپچانے لگا۔

اچانک ہی میری پیشانی پر اوپر سے دوپٹہ نڈا آنا لگا۔

اُس پہاڑ پر خوب گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اندھیرا جنگل اور دیا
کاپانی سیاہ تختہ کی طرح معلوم دیتا تھا۔ اچانک ہی جیسے زمین و
آسمان تھر تھر کانپ اُٹھے۔

آج میرے ملازم بھی نئے مکان میں تھے۔ محل میں میپ جلانے
والا کوئی نہ تھا۔ اس اندھیرے میں میں محسوس کرنے لگا۔ کہ دوشیزہ
فرش پر بیٹھی اپنے بال فوج رہی ہے۔ اس کی پیشانی سے غُون بہہ رہا ہے
کبھی کبھی تو وہ پاگلوں کی طرح ہنس دیتی ہے۔ اپنی انگلیاں کو پھاڑتی
اور اپنی چھاتی بیٹتی ہے۔ کھلے ہوئے دروازوں سے ہوا کے جھونکے
آ رہے ہیں۔

رات بھر پانی برستار رہا۔ میں اندھیرے کمروں میں ادھر ادھر
گھومتا رہا۔ کہیں بھی کوئی نہ تھا۔ اُسی وقت میرا چپڑا سی چلا اُٹھا۔
”الگ رہو۔ ہٹے رہو۔ سب جھوٹ ہے۔“

میں نے دیکھا کہ صبح ہو گئی ہے۔ اور چپڑا سی اپنے اصول کے
مطابق اُسی محل کے چاروں طرف گھوم کر وہی صدا لگا رہا ہے۔
اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ شاید یہ بوڑھا چپڑا سی بھی کبھی میری ہی
طرح محل میں رہ چکا ہے۔ اب پاگل ہو کر بھی اس جال سے آزاد
نہیں ہو سکا۔

میں اُسی دم ہر سات میں اس کے پاس بھاگ گیا۔ اور اُس سے پوچھا ”مہر علی کیا جھوٹ ہے؟“

وہ میری بات کا جواب نہ دے کر پاگلوں کی طرح ہنستا ہوا محل کے گرداگرد بھاگنے اور چلانے لگا۔ ”ہنسنے رہو۔ سب جھوٹ ہے۔ سب جھوٹ ہے۔“

میں اُسی دم دفتر میں جا کر دوسرے چتر اسی سے بولا کہ یرم خان تم بتاؤ۔ کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

کریم خان نے مندرجہ ذیل الفاظ میں سارا قصہ مختصر طور پر بیان کیا۔

اس نے کہا اس محل میں پہلے بہت محفلیں لگا کرتی تھیں۔ ناچ رنگ کا تو کہنا ہی کیا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا۔ جب ستار اور دوسرے سازوں کی آواز نہ آتی ہو۔ اور اس محل میں محبت کی آگ جلا کرتی تھی۔ انہیں سب دلوں کی جلن سے۔ انہیں سب پر محبت کا نوں کے فراق میں محل کے پتھر تک بیتاب ہیں۔ نوجوان اور خوبصورت آدمی کو پا کر وہ اسے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ جو تین رات تک اس محل میں رہا۔ وہ پھر باہر نہیں جاسکا۔ مگر مہر علی پاگل ہو کر یہاں سے باہر نکل آیا۔

میں نے پوچھا۔۔۔ تو کیا اب میرے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے؟

کریم خان نے کہا ”صرف ایک راستہ ہے۔ جو بہت مشکل ہے
 سینے۔۔۔ لیکن وہ راستہ تباہی سے پہلے گل باغ کی ایک ایرانی
 خادمہ کا قصہ کہنا بہت ضروری ہے۔ ویسا حیران کن اور دل توڑ
 واقع آج تک نہیں ہوا ہو گا۔

اسی وقت کلیوں نے آکر کہا۔ گاڑی آرہی ہے۔ جلدی میں
 بچھونے باندھتے باندھتے گاڑی آگئی۔ اُس گاڑی کے ایک فرسٹ
 کلاس ڈبہ میں سے ایک انگریزیشن کا نام پڑھنے کی کوشش میں کھڑکی
 سے سر باہر نکالے کھڑا تھا۔ ہمارے نئے دوست کو دیکھتے ہی وہ ہیلو“
 کہہ کر خوشی سے چلا اُٹھا۔ اس انگریز نے اس کو اپنے پاس بٹھالیا اور
 ہم لوگ سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہ شخص پھر نہ بلا اور نہ
 ہی ایرانی نوکرانی کا قصہ معلوم ہوا۔

میں نے اپنے دوست سے کہا۔ وہ شخص ہم کو بے بہرہ دیکھ کر
 ہمیں بے وقوف بنا گیا ہے۔ یہ قصہ شروع سے آخر تک بھوٹ ہے
 اس طعنہ زنی پر میری اور میرے دوست کی کھٹ پٹ ہو گئی۔

شعلة الم

افسانة نمبر ۱۴

آخری خواہش

اس عالم کے جشن میں مجھے بھی مدعو کیا گیا ہے۔ جس سے میری
زندگی خوشی سے بھر گئی ہے۔ میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ میرے کان سن
چکے ہیں۔

اس جشن میں ساز بجانے کا کام میرے سپرد کیا گیا تھا۔ مجھ سے جو
کچھ ہوسکا۔ میں نے کیا۔

میں دریافت کرتا ہوں۔ کہ کیا وہ وقت آگیا۔ کہ میں اندر داخل ہو سکوں۔
اور تیرا حسین چہرہ دیکھ کر اپنا خاموش پر نام تیرے چہروں میں پیش کر دو



شعلہ الم

کانپور کے زمیندار بابورام گوپال کے گھر کی ودھوا بہو کے والدین میں سے کوئی نہ تھا۔ سسرال میں بھی اپنا کہلانے والا کوئی نہ تھا۔ نہ خاوند تھا۔ اور نہ ہی کوئی بیٹا۔ بیٹی۔ اس کے خاوند کے بڑے بھائی رام گوپال کا ایک ننھا سا بچہ تھا۔ جسے بہو بہت ہی محبت کرتی تھی۔ اس بچہ کی پیدائش کے بعد اس کی والدہ بہت عرصہ تک بیمار رہی۔ اس لئے بچہ کی پرورش بہو۔ کلیانی نے ہی کی۔ بچہ اس سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ اپنی حقیقی والدہ کے پاس دم بھر کو بھی نہ جاتا تھا۔ کلیانی بھی اس سے بہت خوش تھی۔

ایک دن اچانک ہی کلیانی اپنے محبت بھرے دل کو بچنے کے
 پیرِ دکر کے اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔ نہ معلوم کس صدمہ سے
 اس کی حرکتِ قلب یک لحث بند ہو گئی۔ دنیا کے سب کام حسبِ معمول
 چل رہے تھے۔ مگر اس محبت بھرے دل کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند
 ہو گئی۔ بعد میں پولیس آکر تنگ نہ کرے۔ اس دُور سے رام گوپال
 نے چار براہمنوں کو اکٹھا کر کے کلیانی کی لاش کو شمشانِ پہنچانے کا انتظام
 جلدی جلدی کر دیا۔ کانپور کا شمشانِ سبتی سے بہت دُور تھا۔ تالاب
 کے کنارے ایک جھونپڑی تھی۔ اور اس کے پاس ہی بڑا ایک گھنا
 درخت تھا۔ اس کے علاوہ اس جنگل میں اور کچھ نہ تھا۔ پہلے اس جگہ
 ایک نالہ بہتا تھا۔ جس وقت کا یہ ذکر ہے۔ اس وقت وہ نالہ خشک
 ہو گیا تھا۔ اُسی خشک نالے کے ایک حصہ کو ٹھیک کر کے شمشان کا
 تالاب بنالیا گیا تھا۔ اس وقت لوگ اس تالاب کو بڑا پاک سمجھتے
 تھے۔

لاش کو جھونپڑی میں رکھ کر چاروں آدمی لکڑی کی انتظاریں
 بیٹھے رہے۔ لکڑی آنے میں جب بہت دیر ہو گئی۔ تو ان میں سے
 دو آدمی یہ دیکھنے کے لئے چلے کہ لکڑی آنے میں اتنی دیر کیوں ہو گئی
 ہے۔ اور دو آدمی لاش کے پاس ہی بیٹھے رہے۔

سادن کی اندھیری رات تھی۔ بادل گھرا ہوا تھا۔ آسمان میں ایک ستارہ بھی نہ تھا۔ اندھیری جھوپٹری میں دونوں آدمی خاموش بیٹھے تھے۔ ایک آدمی کی چادر میں دیا سلائی اور موم بتی بندھی ہوئی تھی۔ مگر بھیگی ہوئی دیا سلائی بہت کوشش کرنے پر بھی نہ جل سکی۔ ساتھ کی لیمپ بھی ہوا کے زور سے گل ہو گئی تھی۔

کچھ عرصہ چپ رہنے کے بعد ایک بولا، ”اگر اس وقت ایک چلم تبا کو ہوتا۔ تو بہت اچھا ہوتا۔ جلدی کے سبب سے کچھ بھی ساتھ نہ لیا۔“

دوسرا آدمی بولا۔ ”اگر تم کہو۔ تو میں دوڑ کر سب سامان چند منٹوں میں لا دوں؟“

اس کے بھاگنے کے ارادہ کو سمجھ کر دوسرے آدمی نے کہا۔
”باپ رہے! اور میں یہاں اکیلا بیٹھا رہوں گا؟“

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ ایک ایک لمحہ گھٹنے گھٹنے کا معلوم ہونے لگا۔ جو لوگ لکڑی لینے گئے۔ ان کو دل ہول میں گالیاں دینے لگے۔ ان کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ آدمی ضرور کہیں آگاہ سے بیٹھے تبا کو پی رہے ہیں۔

وہاں بالکل سناٹا تھا۔ ہاں تالاب کے کنارے مہینے گولے

کی آوازیں ضرور سُنائی دیتی تھیں۔ اسی وقت ایسا معلوم پڑا۔
جیسے لاش نے جنبش کی۔ مُردہ نے کروٹ بدلی۔

جو آدمی بیٹھے تھے۔ وہ ایشور کا نام لینے لگے۔ اچانک ہی اُس
جھوپٹری میں ایک گہری سانس لینے کی آواز آئی۔ دونوں آدمی
ایک دم جھوپٹری سے باہر نکلے۔ اور بھاگتے بھاگتے گاؤں کی
طرف چلے۔

دوسیل کے قریب دوڑنے پر انہوں نے دیکھا کہ ان کے
دونوں ساتھی لیپ ہاتھ میں لئے واپس آ رہے ہیں۔ جو آدمی لکڑیوں
کے لئے گئے۔ دراصل وہ لتبا کو پینے ہی گئے تھے۔ لکڑیوں کا انہیں
کوئی فکر نہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کہا۔ کہ
لکڑیاں کاٹی جا رہی ہیں۔ دوکان دار ابھی مزدوروں کے ذریعے
بھیجے گا۔ تب جو دونوں دوڑ کر آئے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں
سے لاش کے ہلنے اور سانس لینے کا واقعہ سُنا یا۔ مگر ان دونوں نے
ان کا تسخر اڑایا۔ اور انہیں لاش اکیلی چھوڑ آنے پر خوب ڈانٹا۔

اُسی وقت پھر چاروں آدمی اس جھوپٹری میں پہنچے۔ جھوپٹری
کے اندر جا کر دیکھا۔ لاش غائب تھی۔ کفن کا کپڑا ادھر ادھر
پڑا تھا۔

سب لوگ حیل رنی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہوئے۔
جھو پٹری سے باہر آئے۔ باہر بھگی زمین پر چھوٹے چھوٹے قدموں
کے نشان موجود تھے۔

رام کو پاں اس واقعہ کا ذکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ
سوچ کر آدمیوں نے صلاح کی کہ لاش جلا دی گئی ہے۔ یہ کہہ کر
اپنی جان بچھڑانی چاہئے۔

صبح جو آدمی لکڑیاں لے کر آئے۔ انہیں خبر ملی کہ لکڑیاں دیر
تک نہ آنے سے لاش کو جھو پٹری میں پڑی لکڑیوں سے جلا دیا گیا
ہے۔ چونکہ لاش کوئی قیمتی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ جسے کوئی دھوکہ دیکر
چوری کر لے۔

(۲)

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کئی بار انسان پر ایک خاص قسم کی
بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور کئی کئی گھنٹے تک جسم میں زندگی کا
کوئی بھی آثار نظر نہیں آتا۔ اور بعد میں خود بخود زندگی کے آثار۔
نمودار ہو جاتے ہیں۔ کلیا فی بھی مری نہ تھی۔ بلکہ کسی صدمہ سے بہوش
ہو گئی تھی۔ جس سے اس کی زندگی کے سب آثار غائب ہو گئے تھے۔
جب اسے ہوش آیا۔ اور اپنے چاروں طرف اندھیرا دیکھا۔ تو گھبرا

گئی۔ اُسے اندھیرے میں بھی معلوم ہو گیا۔ کہ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔ ایک دفعہ اس نے اپنی جیٹھانی کو ”بہن جی“ کہہ کر بھی پکارا۔ لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ خوف کے مارے وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے بے ہوشی کی پہلی یاد آنے لگیں۔

اس کی جیٹھانی رسوئی گھر میں بیٹھی بچے کے لئے دودھ گرم کر رہی تھی۔ اپنی گود خالی دیکھ کر وہ برداشت نہ کر سکی تھی۔ اسی سبب سے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ اس نے بھری آواز میں پکارا ”بہن“ بچے کو لے آؤ۔ یہ معلوم میرا دل کیوں چھٹا رہا ہے۔ اس کے بعد چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک کتاب پر سیاہی کی بوتل الٹ گئی ہو۔ اس کی یادداشت کو طاقت زایل ہو گئی۔ وہ بھول گئی کہ اس وقت بچے نے اسے اپنی توتلی بان سے چاچی کہہ کر پکارا۔ ابھی تھا یا نہیں۔

پہلے کلیانی کو خیال آیا۔ کہ شاید یم پوری میں ایسا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ وہاں کچھ بھی سننے اور دیکھنے لائق نہیں ہے۔ نہ کوئی شغل ہوتا ہے۔ صرف سونا اور سوکرا اُٹھ بیٹھنا ہی کام ہے۔

لیکن جب کھلے دروازے سے ہوا کا جھونکا آیا۔ اور مینڈکوں کی آواز سنی۔ تو اُسے برسات کا خیال آیا۔ ایک بار پہلی چمکی۔ جس سے اُس نے دیکھا کہ باہر تالاب ہے اور تھوڑی دیر پہرے کا درخت۔ اُسے یاد آگیا کہ کبھی کبھی تہواروں کے موقعوں پر وہ اس تالاب پر نہانے آیا کرتی تھی۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ گھر چلی چلوں۔ مگر جب میں خیال کیا کہ میرا گھر ٹوٹا ٹھیک نہیں۔ وہاں کسے لوگوں کا خیال ہے کہ میں مر گئی ہوں۔ مجھے کوئی گھر نہیں رکھے گا۔ میرے وہاں جانے سے لوگ بُرا خیال کریں گے۔ دُنیا سے تو میں اُٹھ گئی ہوں۔ اب ایک بھوت ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو بھلا لوگ مجھے کیوں رام گوپال کے عالیشان گھر سے لاکر یہاں سُستان شمشان میں پھینک جاتے۔ رام گوپال کے گھر میں بے ہوشی کا واقع اس کے ذہن میں آگیا۔ اور اپنے کو اپنی بستی سے اتنی دُور پا کر وہ سوچنے لگی۔ کہ اب میرا اس زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اب اپنی رُوح کی چھایا ہوں۔

یہ سوچ کر وہ جھوپڑی سے نکلی اور چل دی۔ دُور فکر اور شرم دیا اب اُس سے کہہ سوں دُور تھے۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں تھک گئے۔

وہ کمزوری محسوس کرنے لگی۔ مگر کسی طرح بھی وہ سنسان جنگل ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

صبح ہوئی تو اُسے گاؤں کے گھروں سے دھواں نکلتا دکھائی دیا۔ اس وقت اُسے کچھ ڈر سا معلوم ہوا۔ اُسے یہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ کرزین کے ساتھ۔ انسانوں کے ساتھ اس کا اس وقت کیا رشتہ ہے۔ جب تک وہ سنسان جنگل میں تھی۔ رات کے اندھیرے میں تھی۔ تب تک وہ بے خوف تھی مگر اب بستی کے آدمیوں سے ڈر سا آنے لگا۔

زیادہ چلنے اور برسات کسے ہونے کے سبب سے کلیانی کے سب کپڑے کیچڑ سے بھر گئے تھے۔ تھکاوٹ اور رات کے جاگنے سے اس کے چہرے سے پاگل پن ٹپکتا تھا۔ شاید گاؤں کے لڑکے اُسے پاگل سمجھ کر پتھر مارتے۔ مگر خوش قسمتی سے سب سے پہلے اسے ایک راگبیر ملا۔ اس شریف راگبیر نے کلیانی سے کہا ”آپ کسی بھلے گھر کی معلوم پڑتی ہیں۔ اس حالت میں اکیلے کہاں جا رہی ہیں؟“

کلیانی نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی۔ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ کہ دُنیا میں ہے۔ یا وہ کسی بھلے خاندان کی ہے۔ راگبیر کی یہ سب باتیں اُسے ایک خواب سی

معلوم ہونے لگیں!

راگبیر نے پھر بڑی ہمدردی سے کہا: ”چلو بیٹی میں تمہارے گھر پہنچاؤں۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟“

کلیانی سوچنے لگی۔ بسراں تو جا ہی نہیں سکتی۔ اور والدین کے ہاں تو کوئی ہے ہی نہیں۔ تب اسے اپنی ایک سہیلی کا خیال آیا۔ سہیلی کا منی سے گوہ لڑکپن سے ہی الگ ہو چکی تھی۔ مگر کبھی کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی ہی رہتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو خط و کتابت میں شکوہ شکایت کے سبب سے آپس میں رُوتھ بھی جایا کرتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو یہی بتانا چاہتی تھیں کہ دونوں میں سے ایک دوسرے کو کون زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس بات کا کسی کو خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ ملاقات ہونے پر کوئی بھی کسی کو لمحہ بھر کے لئے اپنی آنکھوں سے الگ نہ کر سکے گی۔

کلیانی نے اس راگبیر سے کہا۔ کہ انبالہ میں بالوکالی چرن کے گھر جاؤں گی۔

وہ راگبیر لاہور جا رہا تھا۔ اور انبالہ ان کے راستہ میں ہی تھا۔ اس لئے اُس نے اسے اپنے ساتھ انبالہ لے جانے میں کوئی غیر واجب بات نہ دیکھی۔ اور اسے بالوکالی چرن کے ہاں پہنچا دیا

دونوں سہیلیاں بہت مدت بعد ملیں تھیں۔ اس لئے چند منٹ ایک دوسرے کو پہچاننے میں دیر ہوئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک دوسرے کو پہچان گئیں۔

کامنی نے کہا ”ہن آج تو میں بہت ہی خوش ہوں اور اپنے کو خوش قسمت سمجھتی ہوں۔ جو تمہارے ورثہ ہوئے۔ مجھے تو اب تمہارے ملنے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ مگر تم یہاں کیسے آئی ہو۔ سسرال والوں نے تمہیں نکال دیا ہے؟“

کلیانی نے بھری آواز سے جواب دیا ”ہن سسرال کا ذکر مت کرو۔ مجھے یہاں ایک نوکرائی کی طرح رکھ لو۔ میں تمہارا سب کام کروں گی۔“

کامنی نے اسے محبت سے ایک ہلکا سا تھپڑ رسید کیا۔ اور کہا کیا باتیں کہتی ہو۔ تم میری سہیلی ہو۔ تم میری.....

اتنے ہی میں بابو کالی چرن گھر میں آگئے۔ کلیانی حیرانی سے اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر وہاں سے دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔ اس نے نہ تو پردہ ہی کیا۔ اور نہ شرم ہی ظاہر کی۔ کامنی نے اس کے متعلق اپنے خاوند کو سمجھا دیا۔

کلیانی کامنی کے گھر تو آگئی۔ مگر اس سے بے تکلف نہ ہو سکی

اُسے ہر وقت اپنے متعلق ایک قسم کا شک سا لگا رہتا تھا۔ وہ کامنی کی طرف غور سے دیکھتی اور نہ معلوم کیا سوچتی رہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ کامنی اور اس کا خاوند اس سے بہت دُور رہتے ہیں۔ کسی دوسری ہی دُنیا میں۔۔۔۔۔ اور میں ایک چھپایا ہوں۔ کامنی بھی کلیانی کی یہ حالت دیکھ کر فکر مند ہوئی۔ وہ اسے نہ سمجھ سکی جو تیس یہ نہیں چاہتی ہیں۔ کہ کوئی راز وہ چھپائیں۔ اور نہ دوسرا ان سے کوئی راز پوشیدہ رکھے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو ایک دوسرے سے تنگ آجاتی ہیں۔ عورت کی فطرت میں یہ بھی ایک چیز ہے۔

کلیانی اپنے کو کامنی سے دُور رکھنے کی جتنی ہی کوشش کرتی۔ اتنا ہی کامنی اس سے ناراض رہنے لگی۔ اس نے سوچا۔ یہ کیا آفت میں نے اپنے سر اٹھالی ہے۔ مگر دھر کلیانی خود ہی اپنے سے ڈرتی تھی۔ وہ خود ہی اپنے پاس سے بھاگنا چاہتی تھی۔ مگر بھاگ نہیں سکتی۔ اسی لئے کبھی کبھی وہ اپنی کو ٹھٹھری میں پڑی پڑی چلا اٹھتی تھی۔ اس کے ان افعال سے گھر کے لوگ بھی اس سے ڈرنے لگے۔ نوکروں وغیرہ کو بھی گھر میں بھُوت دکھائی دینے لگے۔ ایک دن رات کے وقت کلیانی اپنی کو ٹھٹھری سے اُٹھ کر روتی ہوئی کامنی کے کمرے میں گھسی۔ اور بولی ”بہن۔ میں تمہارے پاؤں چھو رہی

ہوں کیسے مجھ سے رہا نہیں جاتا؟ کامنی کو جیسے ڈر لگا۔ ویسے ہی غصہ کے مارے تمنا اٹھی۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ اسے ابھی گھر سے باہر کرے۔ مگر ہریان کالی چرن نے بہت سمجھا کر اسے ٹھنڈا کیا۔ اور اپنے کمرے کے پاس کی کوٹھڑی میں کلیانی کی رہائش کا انتظام کر دیا۔ دوسرے دن کامنی نے اپنے خاوند سے کہا۔ ”تم کیسے آدمی ہو۔ ایک عورت اپنے سسرال سے نکل کر تمہارے گھر میں آکر رہی ہے۔ ایک ماہ سے اوپر ہو گیا۔ مگر وہ چلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ مگر تم ہو کہ اس بات کا خیال ہی نہیں کرتے۔ تمہارے دل میں کیا ہے؟ کیا مرد ایسے ہی ہوتے ہیں؟

کالی چرن سمجھتے تھے۔ کہ کلیانی کے سسرال والے ضرور اس پر ظلم کرتے ہونگے اور اُس ظلم کو برداشت نہ کرتے ہوئے ہی یہ ہمارے گھر میں آگئی ہے۔ اس کے والدین بھی نہیں ہیں۔ اس حالت میں میں کس طرح اسے گھر سے نکال دوں۔ مگر کامنی کی باتوں سے بھی اس کو دلی چوٹ پہنچی۔ اپنے گھر کی خوشیوں کو وہ مٹانا نہ چاہتا تھا۔ آخر وہ کانپور کلیانی کے سسرال میں گیا۔

جب کالی چرن کانپور گئے۔ تو کامنی۔ کلیانی کے پاس آئی اور بولی۔ ”اب تمہارا یہاں رہنا نہ ہوگا۔ لوگ چمکیوئیاں کر رہے ہیں۔“

کلیانی نے سنجیدگی سے کہا ”مگر میرا لوگوں سے کیا رشتہ ہے؟“
 یہ سُن کر کامنی سنائے میں آگئی اور کُخت لہجہ میں بولی ”تمہارا
 رشتہ نہ ہو۔ مگر ہمارا تو ہے۔ ہم دوسرے گھر کی بیوی بیٹی کو کیا کہہ کر
 اپنے گھر رکھ سکتے ہیں۔ تم سُسرال کیوں نہیں چلی جاتی؟“
 کلیانی نے کہا ”میرے سُسرال اب کہاں ہیں۔۔۔ ہیں؟“
 کامنی نے کہا۔ ”باپ رہے۔ تم کہتی کیا ہو؟“
 کلیانی نے سانس چھوڑتے ہوئے کہا ”کیا تم لوگوں کی کچھ ہوں؟
 تم لوگ ہنسنے ہو۔ روتے ہو۔ پیار کرتے ہو۔ اور سب باتیں کرتے
 ہو۔ اور میں صرف تمہارا اُمّہ دیکھنا کرتی ہو۔ غم انسان ہو۔ اور میں چھایا
 ہوں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کراشور نے مجھے ایک دفعہ لے کر بھی
 کیوں تمہاری دُنیا میں بھیج دیا ہے؟“
 کلیانی کی یہ باتیں سُن کر کامنی نے اس کا مطلب کچھ اور ہی
 نکالا۔ وہ اس کا اشارہ نہ سمجھ سکی۔ اس نے کچھ جواب بھی نہ دیا۔ مَنہ
 پھلا کر کمرہ سے چل دی۔

(۳)

رات کے ساڑھے دس بجے جب کالی چرن کا بندر سے واپس آیا
 اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بارش اتنے زور سے

ہو رہی تھی۔ کہ خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ اب بند نہ ہوگی۔

کامنی نے پوچھا ”سنائیے کیا ہوا؟“

کالی چرن نے کہا ”بہت سی باتیں ہیں سچھے کہوں گا“ یہ کہہ کر اُس نے کپڑے اتارے کھانا کھایا۔ اور پھر لیٹ کر تبا کو پینے لگے۔ ان کے چہرہ سے غمگینی ٹپکتی تھی۔

کامنی بہت دیر سے چپ تھی۔ اُس نے اپنے خاوند سے پوچھا ”کہو۔ کیا سنا؟“

کالی چرن نے کہا ”تم نے ضرور غلطی کی ہے۔“ کامنی یہ سن کر اپنے دل میں شرمندہ ہوا کھٹی عورت کبھی بھولی نہیں کرتی۔ اور اگر کہے بھی تو ایک عقلمند آدمی کو اسے عورت پر ظاہر نہ کرنا چاہئے۔ اس غلطی کو اپنے سر لینے ہی میں بھلائی ہوتی ہے۔ کامنی نے ذرا گرم ہو کر کہا۔ ”کیسی غلطی ذرا میں بھی تو سنوں“

کالی چرن نے کہا ”جس عورت کو تم نے گھر میں رکھا ہے۔ وہ تمہاری کلیا نی نہیں ہے۔“

ایسی بات سن کر غصہ آجانا بالکل معمولی بات ہے اور خاص کر اپنے خاوند کے منہ سے سن کر کس طرح عورت اپنے آپ میں رہ سکتی ہے؟

”بہت خوب۔ میں اپنی سہیلی کو نہیں پہچانتی۔ تمہارے پہچاننے سے تو پہچانوں گی۔“ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ تم اپنی سہیلی کو نہیں پہچانتی۔ مگر میں یقین سے کہتا ہوں۔ کہ تمہاری سہیلی مرچکی ہے۔ اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

کامنی نے ہنس کر کہا ”ذرا ان کی باتیں تو سنو۔ تم ضرور کوئی غلطی کر آئے ہو۔ تم کسی اور کے ہی گھر چلے گئے ہو۔ تم سے وہاں جانے کو کس نے کہا تھا۔ ایک خط لکھ کر بھیج دینے سے ہی سب معاملہ صاف ہو جانا۔“

اپنی عورت کی اس طعنہ زنی سے اس ہو گھر کالی چرن اس بات کا ثبوت دینے لگے۔ مگر اس بات کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ دونوں طرف سے ”ہاں نہ“ ہوتے ہوتے آدھی رات سے زیادہ گزر گئی۔ مگر دل سے دونوں ہی کلیانی کو گھر سے نکال دینے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ کالی چرن کا خیال تھا کہ وہ عورت کلیانی بن کر اس گھر میں رہ رہی ہے۔ اور اس نے کامنی کو دھوکا دیا ہے۔ اور کامنی کا خیال تھا کہ کلیانی گھر سے ناراض ہو کر بھاگ نکلی ہے۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی کوئی اپنی بار نہ مانتا تھا۔ کالی چرن کہتا۔ وہ کلیانی نہیں ہے۔ اور کامنی کہتی کہ کلیانی یہی ہے۔

اسی طرح بحث کرتے کرتے دونوں کی آواز تیز ہو گئی۔ انہیں اس بات کا خیال نہ رہا۔ کہ بغل کی کوٹھڑی میں کلیانی کی رہائش ہے۔

کالی چرن نے کہا: ”بڑی مشکل کی بات ہے۔ میں سن آیا ہوں کہ کلیانی مر چکی ہے۔“
 ”میں کیسے یقین کر دوں۔ جبکہ وہ میرے سامنے موجود ہے۔“
 ”اچھا تو کلیانی کب مر رہی تھی؟“

اس نے سوچا کہ کلیانی کے مرنے کی تاریخ اس کی کسی چھٹی کی تاریخ سے بلا کر اپنے خاوند کو نچا دکھلا دینگی۔
 مگر جب کالی چرن نے کلیانی کے مرنے کی تاریخ بتلائی۔ تو حساب کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ جس دن کلیانی ان کے گھر آئی تھی۔
 ٹھیک اس کے ایک دن پہلے کلیانی کے مرنے کی تاریخ تھی۔ یہ دیکھتے کامنی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کالی چرن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
 عین اسی وقت کامنی کے کمرہ کا دروازہ کھلا۔ ہوا سے چراغ گل ہو گیا۔ کمرہ میں اندھیرا چھا گیا۔ اس وقت کوئی تین پہر کے قریب رات گزری ہوگی۔ باہر پانی برس رہا تھا۔

کلیانی نے کہا ”ہن۔ میں تمہاری سہیلی کلیانی ہی ہوں۔ لیکن

اب میں زندہ نہیں مر چکی ہوں۔“

کامنی کی چیخ نکل گئی۔ کالی چرن کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔
کلیانی پھر کہنے لگی ”مرنے کے علاوہ میں نے مہتا۔ کیا تصور کیا
ہے۔ میرے لئے اگر دونوں جہانوں میں جگہ نہیں ہے۔ تو بتاؤ میں
کہاں جاؤں؟“

وہ پھر چلا کر بولی ”کہاں جاؤں؟“ یہ کہتے ہی وہ گھر سے باہر
نکل گئی۔

— (۴) —

کلیانی کسی نہ کسی طرح اپنے سسرال کا پورہ پہنچی۔ اُس وقت اس
کی جینھانی اپنی ایک مہیلی کے ساتھ تاش کھیل رہی تھی۔ نوکرانی
باورچی خانہ میں تھی۔ بیمار بچہ بخار اتر جانے پر سویا پڑا تھا۔ کلیانی
نظر بچا کر بچہ کے پاس پہنچی۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ کر سسرال آئی تھی وہ
خود بھی اس بات کو نہ جانتی تھی۔ شاید آخری مرتبہ اپنے ہاتھوں سے
پرورش پائے ہوئے بچے کو دیکھنے کے لئے ہی آگئی ہو۔

چراغ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ بیمار بچہ پڑا سو رہا ہے۔ یہ
دیکھ کر اس کی آنکھیں محبت سے اُٹ پڑیں۔ اُسے اُٹھا کر وہ محبت کئے
بغیر نہ رہ سکی۔ وہ سوچتی تھی کہ میں نہیں ہوں۔ اس بچے کو دیکھنے والا۔

اس کی خیر خبر لینے والا اور کون ہے۔ اس کی ماں کو اس کا کچھ خیال نہیں ہے۔ میں نے ہی اس کی پرورش کر کے اُسے اتنا بڑا کیا ہے۔ اب کون اس کی پرورش کرے گا۔ اچانک ہی بچے نے کروٹ بدلی۔ کمزور آواز سے بولا ”چاچی! پانی دو۔ کلیا نی اپنے دل میں کہنے لگی۔ میرا بچہ ابھی تک مجھے نہیں بھولا۔“ اس نے جلدی سے اُسے پانی پلایا۔

جب تک تو بچہ نیند میں تھا۔ تب تک تو وہ پہلے کی طرح چاچی کے ہاتھ سے پانی پتیارہا۔ مگر جب کلیا نی نے اُسے پھر لٹا دیا۔ تب ان کی نیند کھل گئی۔ وہ چاچی سے لپٹ کر بولا۔ ”چاچی! تم مر گئی تھی؟“

چاچی نے کہا ”ہاں بچہ۔“
بچے نے بھولے پن سے کہا ”اب تو پھر آگئی ہے۔ اب تو تم نہیں مرو گئی؟“

اس کا جواب دینے سے پہلے ہی بہت شور و غل مچ گیا۔ نوکرانی بچہ کے لئے ساگودانہ لے کر آئی۔ یک نخت کلیا نی کو دیکھ کر ساگودانہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی نوکرانی کی چلاؤ سن کر جٹھانی بھی تاش پھینک کر آئی۔ اور یہاں کا نظارہ دیکھ کر

دنگ رہ گئی۔ اس کا جسم کانپ اٹھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔
یہ سب معاملہ دیکھ کر بچہ بھی ڈر گیا۔ اس نے رو کر کہا ”چاچی
تم جاؤ۔“

کلیانی نے آج کئی دنوں بعد محسوس کیا۔ کہ وہ مری نہیں۔
ہے۔ وہی پرانا گھر۔ وہی آدمی۔ وہی بچہ اور وہی بچہ کی محبت
ہے۔ اس میں اور ان سب چیزوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کاشی
کے ہاں اُسے یہی خیال تھا۔ کہ وہ مر گئی ہے۔ مگر بچے کے گھر آ کر
اس نے دیکھا اور سمجھا کہ وہ مری نہیں۔ زندہ ہے۔ اس نے اپنی
جلیٹھانی سے کہا ”بہن! مجھے دیکھ کر تم کیوں ڈر رہی ہو۔ میں تو
زندہ ہوں، رام گوپال کی عورت کھڑی نہ رہ سکی۔ وہ بے ہوش
ہو کر گر پڑی۔“

اتنے میں رام گوپال اندر آئے۔ کلیانی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔
اور ہاتھ جوڑ کر بولے ”بھو! کیا تم کو یہی لازم ہے۔ یہی ایک بچہ ہمارا
خاندان میں ہے۔ اس پر ہمارا ہی نگاہ کیوں ہے۔ ہمارے مرنے کے
بعد سے ہی ہمارا یاد میں دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی
بیماری نہیں جاتی۔ وہ دن رات چاچی۔ چاچی کرتا رہتا ہے۔ جب
تم اس دُنیا سے چلی گئی ہو۔ تو ہمارے لئے یہ محبت اچھی نہیں۔ ہم

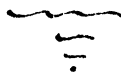
مہتابا انشا دھ گیا میں کرا دیں گے۔“

یہ سن کر کلیانی بے صبری ہو گئی۔ اُس نے کڑک کر کہا۔ میں مری نہیں ہوں۔ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔ کہ میں مری نہیں ہوں۔ یہ دیکھ۔ اتنا کہہ کر اُس نے لوٹا اٹھا کر سر میں مارا۔ مہر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔

پھر اُس نے کہا۔ دیکھو میں جلتی جاگتی ہوں۔ رام گوپال بہت کی طرح کھڑے رہے۔ بچہ ڈر سے دادا۔ دادا پکارنے لگا۔ دونوں بیہوش عورتیں زمین پر پڑی تھیں۔

ہوش آنے پر کلیانی دیتیں مری نہیں۔ میں مری نہیں“ کہہ کر باہر نکل گئی۔ اور باہر صحن کے کنوئیں میں کود پڑی۔ رام گوپال نے اندر سے ہی اس کے کودنے کی آواز سنی۔

رات بھر پانی بہتا رہا۔ اس کے دوسرے دن بھی پانی بہنا بند نہ ہوا۔ اس طرح مری ہوئی کلیانی نے پھر مر کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ مری نہ سکتی۔ رام گوپال کے دل میں ہمیشہ کیلئے شعلہ الم روشن کر گئی۔



شعله آب

افسانه نمبر ۱۵

خواہش

میرے نعروں نے اپنی زیائش دور پھینکی ہے۔ انہیں آرائش کا
غور نہیں رہا

زیور ہمارا اطلاپ نہیں ہونے دیتے۔ وہ تیرے اور میرے درمیان
حائل ہیں۔ اُن کی جھنکار میں مری آرزو پوشیدہ تر ہو جاتی ہے۔

میری پر غور شاعری تیرے مقابل جھوٹے غرور سے شرمندہ ہو کر
زائل ہو جاتی ہے! اے اُستاد الشعرا! میں تیرے قدموں میں آ بیٹھا ہوں
مجھے اپنی زندگی کو سیدھا اور سادہ بنانے دے تاکہ میں بالسرے کی طرح
رف تیرے ہی لئے ایسے موسیقی سے معمور کر دوں۔

شعلہ آب

لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام رکھا گیا ”سو بھاشینی“ یعنی شیریں زبان والی۔ مگر قدرت ایک الجھی گتھی ہے جسے آج تک کوئی بھی سلجھا نہیں سکا۔ اس بات کا کسے علم تھا۔ کہ لڑکی بڑی ہو کر گونگی ہوگی۔ اس کی دو بڑی بہنیں تھیں۔ ایک سکیشنی دوسری سو بھاشینی۔ اور اسی مقابلہ سے اُس کا نام رکھا گیا تھا۔ سو بھاشینی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہو گیا ہے۔ جب لمبا نام ہو۔ تو کہنے والے مختصر ہی کہتے ہیں۔ اختصار کے طور پر سو بھاشینی بھی سو بھا کے نام سے مشہور ہونے لگی۔

پہلی دو لڑکیوں کی شادی خواہش کے مطابق ہو چکی تھی۔ مگر اب یہ چھوٹی لڑکی والدین پر ایک خاموش مگر وزنی بوجھ کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ عام خیال تھا کہ جیسے یہ قوت گویائی سے محروم ہے۔ ویسے ہی اس کا خانہ عقل بھی خالی ہو گا۔ اور وہ اپنی شادی کی ضرورت کو بالکل محسوس نہیں کر سکتی۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ سو بھلا کی ذہن تھی۔ اور یہ خاص طور پر دیکھا گیا ہے کہ قدرت نے جسے ایک نعمت سے محروم کیا ہو۔ اس کی دماغی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے سو بھلا بچپن سے ہی خود کو والدین پر ایک بوجھ خیال کرتی تھی۔ مگر اُسے اس کی تلافی کے لئے کوئی بھی ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔ ہاں اُس کی یہ کوشش ہر وقت تھی۔ کہ عوام سے دور رہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ دینا کو بھول جانا چاہتی مگر ایسے گناہ کے لئے ناممکن سا ہو گیا تھا۔

اس کے والدین اس تکلیف کو بھول جانے کی کوشش کرتے مگر نہیں۔ دلی درد کو کوئی نظر انداز کر سکتا ہے؟ اس کی وجہ سے وہ شب و روز نہایت نگر مند رہتے۔ خاص طور پر اُس کی ماں تو اُسے بڑی ہی بے چین اور بالوس نظروں

سے دیکھتی۔ مگر ایک آہ سرد کھینچ کر رہ جاتی۔ قدرت کے آگے کسی کار و ز نہیں۔

ماں کو لڑکے کی بہ نسبت لڑکی سے زیادہ اُنس ہوتا ہے اور وہ اچھی طرح سمجھتی ہے۔ کہ میں نے اسے ایک قابل عورت بنانا ہے اگر اُس میں کسی قسم کی کمی ہو تو وہ اُسے اپنی توہین تصور کرتی ہے۔ اور خود بخود ذلت و شرم محسوس کرتی ہے۔ سو بھاکا باپ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ مگر ماں اُسے خود پر ایک دھبہ خیال کرتی ہے۔ دل ہی دل ایشور کو خود کو قسمت کو اور کبھی کبھی سو بھاکو بھی گالیاں دینے لگتی تھی۔

سو بھاکو قدرت نے زبان تو عطا نہ کی تھی۔ مگر دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تو موجود تھیں۔ جب کبھی کوئی خیال اس کے دماغ میں پیدا ہوتا۔ اس کے ہونٹ کانپ اُٹھتے۔ آنکھیں اظہار خیال پر آمادہ ہو جاتیں۔

جب یہیں کبھی اپنا خیال ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ تو ابتدائی الفاظ کی بندش کے لئے کافی دماغ سوزی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ الفاظ کو تجویز کرنا بالکل آسان کام نہیں۔

اپنے خیال کی ترجمانی کے لئے یہ مکمل ہے۔ کہ ہم کبھی

غلطی کر دیں۔ مگر قدرت نے اُنکھیں ایک ایسی شے بنائی ہیں۔ جن کو ترجمانی کے لئے کسی قسم کی الفاظ کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارا اپنا ہی دماغ اُن پر ایک قسم کا سایہ ڈال دیتا ہے۔ اور اُنکھیں خود بخود اظہارِ مدعا کر دیتی ہیں۔ پھر کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہتی۔ اصل تجلّی پتیلیوں سے اس طرح چمک اُٹھتا ہے۔ جس طرح سیاہ بادلوں میں بجلی یا طلوع ہوتا ہوا آفتاب۔ ہم اپنی خوشی کو غمی کو شرارت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ مگر اُنکھیں انہیں ظاہر کئے بنا نہیں رہتیں۔

جن کو قدرت نے قوت گویائی عطا نہیں کی۔ وہ اپنی آنکھوں سے ہی زبان کا کام لیتے ہیں۔ جن کا اظہار گہرے سمندر کی طرح اُٹھتا ہے۔ مگر نمایاں آسمان کی طرح یعنی گونگے ایک بے بہا دولت سے تو محروم ہوتے ہیں۔ مگر ایک عجیب اور پراسرار سکوت کے مالک سو بھانچا ندپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ جوں دریا واقع تھا۔ جیسے گاؤں چھوٹا سا تھا۔ ویسے ہی دریا بھی چھوٹا تھا۔ اس میں کہیں ظلیفانی نہیں آتی۔ اور نہ ہی کہیں کسی دوسری قسم کی تکلیف ہی گاؤں

والوں کو ہوئی۔ سب اُسے اپنا محن خیال کرتے تھے۔ اور وہ بھی گاؤں کے ہر فرد کے خاندان کا وفادار رکن معلوم ہوتا تھا۔

دریا کے دونوں کناروں پر ہرے بھرے درختوں کا سایہ تھا۔ گویا قدرت کا تمام حسن سمٹ کر یہاں اُگیا ہو۔ آب رواں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے شعلے کے انجام میں مشغول رہتا۔

گوپال کرشن کا مکان آبادی سے کچھ نکلا ہوا دریا کی طرف تھا۔ کشتی میں آنے والے یا اُتر پار جانے والے اس شخص تمام آبادی کا نظارہ اچھی طرح دے سکتے تھے۔ اور خاص طور پر گوپال کرشن کا مکان تو ان کی نظروں میں دھتا۔

سو بھلا اپنے اس مختصر سے مکان سے نکلی کہ ہر روز دریا کے کنارے سبز گھاس پر آبیٹھتی۔ شاید اُسے قدرت کی اس خاموش زبان سے خاص محبت ہو گئی تھی۔ یا اور کچھ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس دنیوی دولت کے حلقہ میں اس بے زبان لڑکی کا کسی کو خیال بھی تھا۔ یا نہیں؟ اس کے لئے تو قدرت خاموش تھی۔ دینا

والے خاموش تھے۔

وہ اپنا کام ختم کر کے چپ چاپ دریا کے کنارے آ بیٹھتی۔
اور قدرت کے خاموش عناصر سے ہم کلام رہتی۔
یہاں دریا کی روانی کا مدھا شور۔ گاؤں والوں کی آوازیں۔
پرنروں کی گلکاریاں۔ پتوں کی سرسراہٹ۔ یہ تمام آوازیں
ایک دوسری سے ٹکڑا کر اس کے لئے باعث اضطراب ہو جاتیں
تمام آوازیں یک جا ہو کر ایک لہر کی صورت میں اس کے آئینہ
دل کو چوٹ لگاتیں۔

قدرت کی نرسنگیاں گویا اُس کی گویائی تھیں۔ سیاہ اور
منور آنکھیں اس کی زبان جو بے مطلب آوازیں اس کے کانوں
تک پہنچتی۔ اس کے نزدیک دنیا والوں کی یہی زبان تھی۔ اس
مقام پر سو بھا کے لئے درختوں کے تنوں سے لے کر خاموش
ستاروں تک خون کے آنسو رونے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے کا
سامان تھا۔

دوپہر کے وقت جب ماہی گیر کھانا کھانے چلے جانے لگاؤں
والے کوئی سرد جگہ تلاش کر کے بغرض آرام بیٹھتے۔ چڑیاں درختوں
پر خاموش ہو جاتیں۔ گھاٹ پر سکوت کی حکومت ہوتی۔ یعنی

ہر چیز تنہائی محسوس کرتی۔ اس وقت نیلگوں آسمان کے نیچے
 قبرت اپنی گونگی زبان سے موجود ہوتی۔ اور یابہ بے زبان
 لڑکی۔

سو بھا کے گھر دو گائیں تھیں۔ سرب باشی۔ اور پنکولی۔ ان دونوں
 نے صرف سو بھا کے منہ سے کبھی اپنا نام نہیں سنا۔ پھر بھی وہ
 اس کے پاؤں کی آواز سے ہی اندازہ لگاتیں۔ کہ سو بھا آ رہی
 ہے۔ گو وہ بھی سو بھا کی طرح بے زبان تھیں۔ مگر اس کی بے
 معنی اور خاموش گفتگو کو خوب سمجھتی تھیں۔ سو بھا ان کے قریب
 آتی۔ اور سرب باشی کی گردن میں اپنے بازو حائل کر دیتی۔ اپنے
 رخساروں کو اس کے رخساروں سے ملتی۔ اسی دوران میں
 پنکولی اسے اپنی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی۔ اور اُس
 کے چہرے کو اپنے زبان سے چاٹتی۔ سو بھا ہر روز نین بار غرور
 اور زیادہ سے زیادہ جتنی بار ہو سکتا۔ ان کے پاس آتی اور
 جب کبھی کوئی اُسے سخت سست کہتا۔ تو اُسی دم اپنی گونگی
 سیلیوں کے پاس چلی آتی۔ تاکہ غم غلط ہو سکے۔ انہیں اذیت
 مین پنکولی اور سرب باشی اس کے دلی درد کو خود پر محسوس کرتیں
 اُس کے نزدیک تر ہو کر اپنے سینک اس کے نرم بازوؤں

سے رگڑتیں۔ اپنی بے چینی اور خاموش زبان سے اس کا غم غلط کرنے کی سعی کرتیں۔ ان دو سہیلیوں کے علاوہ اس کے گھر چند بھریاں اور ایک بلی کا بچہ بھی تھا۔ لیکن سو بھرا کو اُن سے کچھ زیادہ انس تھا۔ مگر وہ اُسے بہت محبت سے دیکھتے تھے جب کبھی بلی کا بچہ موقعہ پاتا اس کی گود میں آجاتا۔ اور سو بھرا اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگی کرتی تو وہ بیٹھی غینہ سو جاتا۔

اشرف المخلوقات میں بھی اُس کا ایک ساتھی تھا۔ مگر اس بات کا اندازہ لگانا کہ اس کے تعلقات اس سے کیسے تھے ذرا مشکل ہے۔

وہ بول سکتا تھا۔ اُس کا نام تھا "گدن" وہ گوسائیس کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ اور آوارہ تھا۔ اس کے اس فعل سے والدین سخت نالاں تھے۔ یہ بات عام مشہور ہے۔ کہ بیکار انسان اپنیوں کو ناخوش کر کے دوسروں سے خراج کشیں لیا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے پاس تو کوئی کام ہوتا نہیں دوسروں کے اشاروں پر چلنا ان کا کام ہوتا ہے۔ بالکل یہی حالت تھی گدن کی۔ جیسے کسی گنجان آبادی کو کسی وسیع میدان

کی ضرورت محسوس ہوتی۔ تاکہ عوام کچھ آرام کا سانس لے سکیں۔ ہوا خوری کر سکیں۔ ایسے ہی ایک گاؤں کے کچھ آدمیوں کو چند بیکاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ بوقت فرصت باکار آدمیوں کا وقت غپ شب میں اچھا گزر سکے جب بھی کسی کو ان کی ضرورت ہو۔ فوراً آ موجود ہوں۔

گدن کو مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق نے یہاں تک زور پکڑا۔ کہ اس کا بہت سا وقت دریا پر کٹنے لگا۔ وہ حسب معمول دیپہر کو دریا پر مچھلیاں پکڑنے جاتا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اس کی اور سوبھا کی ملاقات ہو گئی۔ خواہ وہ بیکار نہایا کچھ کام کرتا تھا۔ مگر اُسے دوست کی پہچان تھی۔ اور دوستی کی قدر تھی۔ جب وہ ساحل پر مچھلیاں پکڑتا۔ تو اس کا ایک خاموش دوست بہترین ساتھی ہوتا۔ گدن سوبھا کی خاموشی کی وجہ سے اُسے خاص توقیر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اسی انس کی وجہ سے وہ اُس کا پورا نام لینے کی بجائے صرف سو ہی کہہ پکارتا تھا۔

سوبھا آمد کے پیڑ کے نیچے آرام سے سر پھیلی پر رکھے بیٹھی رہتی۔ اور گدن چند قدم کے فاصلہ پر اپنی ڈور کو دریا میں ہٹالے

رہتا۔ وہ ہر روز اپنے ساتھ چند خالی پان لے آتا۔ جنہیں سو بھا آرام سے بیٹھی بیٹھی بناتی اور گاہے گاہے اُسے دیتی۔

کافی دیر تک بیٹھے اور مچھلی کا شکار دیکھتے رہنے کے دوران میں سو بھا کی خواہش ہوتی۔ کہ وہ اپنے تئیں کدن پر ایک بڑی سوداگر ثابت کرے۔ اور کسی طرح سمجھاوے۔ کہ وہ اس عالم پر بے کار بوجھ نہیں ہے۔ مگر اس کے پاس اس انظہار کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں ایک غیر معمولی طاقت حاصل کرنے کے لئے بھگوان سے پراختہ کرتی۔ تاکہ وہ اپنی کرامات سے کدن کو متحرک کر سکے۔ اور اس کی زبان سے یہ الفاظ سن سکے۔

”میرے خواب میں بھی نہ تھا۔ کہ میری سُو ایسا کر سکے گی۔“ خیال تو کیجئے اگر سو بھا کوئی پری ہوتی۔ تو وہ دریا سے آہٹ منگی کے ساتھ اُٹھتی۔ اور بجائے ایک حقیر چیز مچھلی کے کدن کے لئے ایک سانپ کا من کنارے پر لا ڈالتی۔ اور کدن اُسی وقت اپنا شکار چھوڑ کر دریا میں چھلانگ لگاتا پھر کسی اور ہی دنیا میں جا پہنچتا۔ اور دیکھتا کہ گونگی لڑکی سُو چاندی کے محل میں زریں بستر پر آرام فرما رہی۔ اس وقت سو بھا جواہرات سے منور ہونے والے شہر کے بادشاہ کی بیٹی معلوم ہوتی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ

ناممکن تھا بالکل ناممکن۔ دراصل ناممکن تو کوئی بات نہیں۔ مگر مشکل تو یہ بات تھی۔ کہ وہ پاناپور کے شاہی خاندان میں پیدا ہی نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک براہمن کے ہاں پیدا ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ گوسائیں کے لڑکے کو حیران کرنے کا کوئی ذریعہ نہ پاتی۔

دنوں کے بعد مہینے اور مہینوں کے بعد سال گزرتے گئے وہ جوان ہو گئی اور خود کو سمجھنے لگی۔ اس دوران میں ایک ناقابل اظہار تخیل سمندر کے وسطی مقامات سے اٹھنے والی موجوں کی طرح جب کہ چاند مکمل ہوتا ہے۔ اس کے دماغ سے پیدا ہوا اور وہ اپنے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھتی۔ پھر سوال کرتی۔ مگر جواب نہ ملتا۔ جس سے اُسے کچھ تسلی ہو۔

شب منور تھی۔ چاند اپنے پورے جوبن میں آسمان پر جلوہ افگن تھا۔ ستارے جھلک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایسی خوبصورت رات پہلے نہیں دیکھی سو بھانے اپنے مکان کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ اور ڈرتے ڈرتے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس وقت قدرت بھی سو بھا کی طرح تنہا، خوابیدہ زمین کو دیکھ رہی تھی۔ سو بھا کی مضبوط اور جوان زندگی یہ عالم دیکھ کر بے تاب ہو گئی اور

رنج و راحت سے اس کا پیما نہ صبر لبریز ہو گیا۔ یوں تو وہ تنہا ہی تھی۔ مگر اس عالم تنہائی نے اُس کے خیال کو اور بھی سخت بنا دیا۔ اس کا دل وزنی ہو گیا۔ اس کی زبان نہ چلتی تھی اس لئے ایک لفظ بھی نہ نکال سکی۔ گویا خاموش دہرتی ماما کے ایک کنارے ایک خاموش حیران اور پریشان لڑکی کھڑی تھی۔

والدین سب کچھ سمجھتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں جو ان سے پوشیدہ ہو۔ سو بھائی شادی کے خیال نے اس کے والدین کو بڑی فکر میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ لوگ اکثر انہیں برا بھلا کہتے اور اپنی برادری سے خارج کر دینے کی دھمکی بھی دیتے۔ عام خیال تھا کہ لڑکی آوارہ ہو رہی ہے۔ اس کے گھر خوشحالی تھی۔ روزانہ دونوں وقت چاول اور چھلی پکتی۔ اس لئے حاسد بھی کم نہ تھے۔ عورتوں کے کہنے سننے سے اس کا باپ کچھ دن کیلئے گاؤں سے چلا گیا۔ اور تھوڑے ہی دن بعد واپس آکر کہنے لگا۔ ہمیں کھلتے چلنا چاہئے۔ سب اس اجنبی مقام پر جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سو بھائی کا دل بیٹھ گیا۔ اسکیں گہراؤ صبح کی طرح تر ہو گئیں اور ایک نامعلوم خوف کی وجہ سے جو اس کے دل میں جم چکا تھا۔۔۔ ایک بے زبان جانور کی طرح وہ اپنے والدین کے پیچھے پڑ گئی۔ اپنی لمبی اور بڑی بڑی آنکھوں سے ان کا منہ دیکھتی اور ان کے دلی خیال معلوم کرنا چاہتی۔ مگر سب

خاموش تھے بالکل خاموش۔

ان تمام باتوں کے دوران میں ایک سپہر کو کدن شکار کرتے کرتے سو بھا کے پاس آ بیٹھا۔ اور ہنس کر کہنے لگا۔

سو تمہارے باپ نے تمہارے لئے اچھا شوہر چنا ہے۔ اب تمہاری شادی بہت جلد ہونے والی ہے۔ کیسی خوشی کی بات ہے؟ کیا تم مجھے بالکل بھول جاؤ گی؟ ایسا نہ کرنا۔۔۔ یہ کہہ کر وہ پھر سنسا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ کدن کے لئے شاید یہ الفاظ بالکل معمولی تھے مگر سیمپاری سو بھا کیلئے ایسا نہ تھا۔ وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح اپنے شکاری کا منہ تکنے لگی۔ اور اپنی خاموش زبان سے دریافت کرنے لگی۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا؟ معاف کرو۔۔۔ وہ اشک بار آنکھوں سے کدن کی طرف دیکھتی رہی۔ مگر زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکی۔ اور چلی گئی۔

اس کا باپ اپنی خواب گاہ میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب سب بھانے اُسے دیکھا۔ اور روتے ہوئے اپنے آپ کو اُس کے پاؤں پر ڈال دیا۔ باپ کی آنکھیں بھی پر نم ہو گئیں۔ اس نے اُسے چھاتی سے لگایا۔ اور بہت پیار کیا۔۔۔ مگر سو بھا کی آنکھوں سے ایک چشمہ ابل پڑا تھا۔ آخر یہ فیصلہ طے ہوا۔ کہ وہ آئندہ صبح کو کلکتہ روانہ ہو جائیں۔ سو بھانے گایوں کے قریب اگر اپنی سہیلیوں کو الوداع و خیر آباد کہی۔ اپنے ہاتھوں سے

کھلایا۔ گلے سے لگایا۔ ان کا چہرہ غور سے دیکھا۔ پھر اُداس ہو گئی۔ اس کی وہ آنکھیں جو زبان کا کام دیتی تھیں۔ اشک بار ہو گئیں۔ اور پھر جیسے کسی برساتی نالے کا بند لوٹ گیا ہو۔ وہ زار و قطار رونے لگی جس شب کا یہ واقعہ ہے۔ وہ رات چاندنی۔ سو بھا کمرے سے نکل کر اسی دل پسند گھاس کے سبز بستر پر لب دریا آلیٹی۔ پھر اپنے دونوں تھ زمین پر اس طرح پھیلا دئے۔ گویا وہ اپنی پُر سکوت ماں سے کہہ رہی ہے۔ ”مجھے اپنے سے جدا نہ کرنا۔ مجھے اپنی آغوشِ محبت میں لے لو۔ اور چھاتی سے لگاؤ۔ مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ دوسرے دن سب روانہ ہو گئے ایک دن کلکتہ کے کسی مکان میں سو بھا کی ماں نے اُسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ سرگودھا۔ فیو یوروں سے آراستہ کیا۔ یہ سب سناں دیکھ کر سو بھا کی آنکھیں اسی سابقہ روانی سے بننے لگیں۔ اس اچھے وقت میں اور ساتھ ہی اس ڈر سے کہ اس کی آنکھیں خراب نہ ہو جائیں اس کی ماں نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ مگر آنسوؤں کی تیزی زیادہ ہو گئی اسی وقت دولہا اپنے ایک دوست کے ساتھ اپنی بیوی کو دیکھنے کے لئے اندر آیا۔ اس وقت والدین کے دل دھک دھک کر رہے تھے مبادا لڑکا لڑکی کو پسند نہ کرے۔ پھر ہم کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ اس امتحان کے داخلہ سے پیشتر سو بھا کی ماں لڑکی کو خاموش

رہنے کی تلقین کر چکی تھی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ تھا۔
معائنہ کرنے والوں نے اُسے دیر تک اوپر سے نیچے تک دیکھا
اور کہا: ”اچھی ہے۔“

اس کے رونے پر خاص توجہ کی گئی۔ اور خیال کیا کہ یہ اس
کے نرم دل ہونے کی ادل دلیل ہے۔ اور اپنے دل میں اس موضوع
پر بحث کی کہ وہ دل جو آج اپنے والدین سے جدا ہونے پر اس
قدر ملول ہے۔ کل یقیناً اچھا ثابت ہوگا۔ آنسوؤں نے جو دراصل
شعلہ غم سے پھل پھل کر خون نکل رہا تھا۔ سو بھائی کی قدر و منزلت
بڑھادی اور دوہانے سو بھائی کوئی نقص نہ پایا۔ آخر کار ایک
مبارک دن شادی کے لئے تجویز ہوا۔ اور اپنی گونگی لڑکی کا ہاتھ
ایک دوسرے کے حوالے کر کے سو بھائی کے والدین اپنے وطن کو
واپس آ گئے۔ انہوں نے شکر کیا۔ کہ وہ دین و دنیا کی برائی سے
بچ گئے۔ بھگوان نے لاج رکھ لی۔

سو بھائی کے شوہر کا روزگار کسی دوسرے شہر میں تھا۔ شادی
کے چند دن بعد وہ اُسے بھی اپنے ساتھ وہاں لے گیا۔ صرف ایک
ہفتہ کے عرصہ میں ہی سب کو معلوم ہو گیا۔ کہ وہاں بے زبان
ہے۔ اگر اس سے پیشتر ان کو معلوم نہ ہو سکا۔ تو اس میں اُس

بیچاری گونگی کا کیا تصور۔ اس نے تو کسی کو بھی دھوکا دینے کی
کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی کبھی زندگی میں اُس نے اس راز کو
کسی سے چھپانے کی کوشش کی اس کی آنکھیں اظہارِ مدعا کریں
تھیں۔ مگر کسی نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔ اُس نے ہر ایک
کو بار بار دیکھا۔ التجا کی۔ مگر سمجھنے والے نہ سمجھ سکے۔ کہ ایک غریب
گونگی کیا کہہ رہی ہے ؟

افسوس بچپن سے جو اس کی خاموش زبان سمجھتے تھے وہ تو
بچھڑ گئے۔ اب وہ اپنا غم غلط کرے تو کس طرح ؟ اب شب و روز
اس کے خاموش دل سے بے آواز مگر کبھی نہ رکنے والی آواز
آیا کرتی۔ جس کو نہامِ دماغ سمجھنے سے قاصر تھے۔ صرف سب کے
دلوں کا حال جاننے والا ہی سمجھ سکتا تھا۔

سوزِ غم میں دیدہ تر کام آسکتا نہیں
یہ وہ آتش ہے جسے پانی بجھا سکتا نہیں

ختم شد

پند اور اق قلم برداشتہ ایم اسلم ضعیف معجز نگار اترسری

طوفان

شری ٹیگور کا بے مثال تحفہ

دنیا ادب کے باکمال شاعر ٹیگور کا نام کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں۔ مندرجہ بالا شاہکار ان کا ماسٹر پیس ہے۔ دلچسپ، سنسنی خیز، عبرت ناک، سبق آموز، حیرت انگیز اور پُر اثر واقعات کا مرقع، انسانی زندگی کے نشیب و فراز، حسن و جمال کی پاکیزہ، دلاویز داستان، دنیا کی سر و مہری، عشق اور فرض کا تصادم۔ اس کا ہر باب آپ کے دل پر اثر چھوڑے گا۔ نہایت پُر درد اور ہر باب میں ایک نئے راز کا اضافہ، آپ ایک بار شروع کر لیں۔ پھر چھوڑنے کو دل نہ چاہے گا۔

قیمت مجلد نمبر

پتلا۔ بھارت پستک بھنڈار، کٹہہ، اہولہ امرتسر

شری ٹیگور کا نایاب تحفہ حیوان پرکھات

ایشیا کے شاعر اعظم ٹیگور کا بلند پایہ بہترین شاہکار دینا
افسانہ نگاری میں بے بدل چیز۔ ادبی دنیا میں ایک عظیم الشان
اضافہ، انسانی خباشت اور شرافت کا پُر سحر مرقع نہایت ہی
عجیب حالات پر مبنی، واقعات دلی صداقت اور استقلال کی زندہ
تصویر، دلچسپ اور اثر انگیز واقعات سے پر حالات، اس کا
باب آپکو ایک سبق دینے کے لئے کافی ہے۔ زندگی کے تلخ تجربات
ایک بیوہ کی خوشچال داستان حیات۔

آپ اسے ایک بار شروع کر دیں۔ اور جب ختم ہو جائیگی تو آپ
شدر رہ جائیں گے۔ کہ کتاب ختم ہو گئی۔ قیمت مجلد غیر

پتہ لکھا:۔ بھارت پوسٹک ہسٹڈار کٹرہ اہوالیہ امرتسر

